فلسفۂ آلِ محمدؐ

حصہ اول

علامہ رضوی جارچوی

علامہ سید ابن حسن جارچوی میموریل سوسائٹی
۳۔ "سی" روڈ۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸ فون نمبر ۶۱۰۴۳۱

فہرست مضامین

نمبر .... صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محبت اور مساوات کی سب سے پہلی آواز

تیرہ سو سال قبل کی تاریخ کا ایک ورق

خدا کا "آخری پیغام" ابوجہل پر نازل ہوتا کہ وہ اپنی قوم کا سردار تھا۔ "اصلاحِ قوم" کی عظیم الشان خدمت ابوسُفیان کے سپرد کی جاتی کہ اُس کا شمار صنادیدِ عرب میں ہوتا تھا، یا کم از کم یہ روحانی عہدہ ابوطالب ہی کو ملتا کہ وہ بھی خانۂ کعبہ کی مجلسِ تولیت کے رُکنِ اعلیٰ تھے، خدایا! ہاشمی گھرانے کے ایک یتیم بچے کو خلعتِ نبوت دے کر، مکہ کے جنگلوں میں بکریاں چرانے والے کو "سردارِ قوم" بنا کر، خدیجۃ الکبریٰ کے تجارتی ایجنٹ کو "اپنا رسول" منتخب کر کے تو نے سرمایہ اور مزدوری کے اُس زبردست فرق کو نمایاں کر دیا جو آج مادہ پرست دنیا کے لیے وقت کا سب سے بڑا سوال بنا ہوا ہے۔

اموی خاندان کے سردار اس ام   ں نہ تھے کہ رسالت کا فخر بنی ہاشم کو
فاقہ کش مزدوروں[1] کے حصے میں   ھوں نے طاقت اور ثروت کے ہر ممکن مظاہرے سے بنی ہاشم[2] کا مقابلہ کیا، تلواریں ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار نیاموں سے نکلیں۔ تشدد اور تخویف کی نمائش پوری شان و شوکت کے ساتھ کی گئی، فوجیں جمع ہوئیں، ہتھیار مہیا کیے گئے، آب و دانہ بند ہوا، ترک موالات کا تیز ترین حربہ استعمال کیا گیا، ایک دو کو چھوڑ کر تمام شہر مکہ بلکہ سارا جزیرۃ العرب رسول اللہ کے خلاف نظر آنے لگا لیکن کیا اس لیے کہ سرمایہ طاقتور ہے، اس کی مدد کے لیے تمام مادی چیزیں تیار ہیں

---

[1] اس مضمون میں مزدور سے مراد وہ انسان ہے جو محنت خود اور کام جیسے، نہ ہو بلکہ محنت اور مشقت سے اپنی روزی پیدا کرے۔ اور سرمایہ دار وہ ہو جو زر پرست، جاہ طلب اور مستبد و خود پسند ہو اور دوسروں کی گاڑھی کمائی پر ڈاکہ ڈال کر اپنا پیٹ پالتا ہو۔

[2] بنی ہاشم اور بنی امیہ کی رقابت بہت پرانی تھی۔ تاریخ کامل ابن اثیر جزری کی عبارت پڑھیے اور غور کیجیے کہ عربوں میں اس دشمنی کے متعلق کیا کیا روایتیں مشہور تھیں۔ آپ ان روایات کو صحیح مانیے یا نہ مانیے لیکن یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں خاندانوں کی دشمنی اس حد پر پہنچ گئی تھی کہ لوگ اس کو قدرتی سمجھنے لگے تھے۔

ان عبد شمس وهاشم توامان وان احدهما ولد قبل الآخر واصبع له ملتصقة بجبهة صاحبه فنحيت فسال الدم فقيل يكون بينهما دم وولي هاشم بعد ابيه عبد مناف ما كان اليه من السقاية والرفادة فحسده امية بن عبد الشمس على رياسته .... فكانت هذه اول عداوة وقعت بين هاشم وامية

عبد شمس اور ہاشم توام تھے۔ ان میں ایک دوسرے سے کچھ دیر پہلے پیدا ہوا تھا، ایک کی انگلی دوسرے کی پیشانی سے چپکی تھی، جس کو جدا کیا گیا تو خون جاری ہوا، لوگ اس کو شگون سمجھ کر کہنے لگے ان دونوں کی نسل میں خونریزیاں ہوں گی۔ ہاشم اپنے باپ عبد مناف کے بعد ان کی ریاست (یعنی خانہ کعبہ کے عہدۂ سقایہ و رفادہ) کے متولی ہوئے۔ امیہ بن عبد شمس کے دل میں اسی وجہ سے حسد پیدا ہوا، اور جو عداوتیں ان دونوں خاندانوں میں ہیں، ان کی ابتدا یہیں سے ہے۔

اُس کے پرستاروں کی جماعت کا دائرہ وسیع ہے' خدا اپنے مقررہ قانون کو بدل دیتا؟

وربّك يخلق ما يشاء ويختار، کچھ لوگوں کی ناراضگی خواہ وہ کتنے ہی بڑے

کیوں نہ ہوں، ایک مصلحِ قوم کی نامزدگی اور انتخاب کو باطل نہیں قرار دے سکتی،

والله يعلم حيث يجعل رسالته۔

اپنے وقت کے سب سے بڑے انسان ہونے کی حیثیت سے رسُول اللہ کو نبوت کا

جلیل القدر عہدہ سپرد کیا گیا تھا اور یہ اُن زبردست کارہائے نمایاں کا صلہ تھا جو

آنحضرتؐ نے مفادِ ملت کے لیے انجام دیے تھے۔

"تاریخ کی روشنی میں اُس زمانے کی حالت پر نظر ڈالیے' مسیحی کلیسا اور عبرانی

دُنیا کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کے بُت پرستوں تک بڑھتے چلے آئیے تو معلوم ہوجائیگا

کہ اُس وقت کی دُنیا میں اس عربی دماغ سے بڑھ کر کوئی دوسری ہستی موجود نہ تھی،

یوں تو بڑے بڑے تاجدار موجود تھے جو تلوار کے زور سے دین کی تبلیغ کر سکتے،

بڑے بڑے سرمایہ دار پڑے تھے جو خزانوں کے مُنہ کھول کر اپنے مشن کو کامیاب

بنا جاتے' مگر بنی نوعِ انسان کے دُکھ درد کا ذاتی تجربہ رکھنے والا طبقۂ ادنےٰ کی

مشکلات اور پریشانیوں کا عینی مشاہدہ کرنے والا' اور پھر "اصلاحِ ملت" کے زبردست

کام کی صلاحیت رکھنے والا' اگر کوئی تھا تو وہ یہی مزدور تھا جس کو طفلی ہی سے اپنی

مدد آپ کرنے کی ضرورت پڑ گئی تھی' جس نے ماں کی آغوش اور باپ کی سرپرستی

سے محروم ہوکر انسانی فطرت کا زبردست مطالعہ کیا تھا، زمانے کی گردشوں نے

اُسے اُن تمام مصائب سے واقف کر دیا تھا جو اس دُنیا میں طبقۂ ادنےٰ کو پیش آتے ہیں، اسکا ہمدردی سے بھرپور دل ان مشکلات کا حل ڈھونڈنا چاہتا تھا، اُس کا متجسس دماغ ان مصائب کے دفعیہ کی تدابیر تلاش کرنے کا خواہش مند تھا، قدرت نے عین وقت پر اُس کی مدد کی، اور غارِ حرا کی تاریکیوں میں اُسے وہ نُور نظر آیا جو کوہِ طور پر حضرت موسےٰ کو اور زیتون کے پہاڑ پر حضرت عیسٰی کو نظر آچکا تھا۔

عرب کے سب سے بڑے مزدور نے جب اپنا اصلاحی مشن شروع کیا تو اُس کو ایک شریکِ کار اور رفیقِ عمل کی ضرورت ہوئی، ایک مجلس منعقد کی گئی، اُس میں بنی ہاشم کم و بیش سب ہی معززین شریک تھے، رسُول اللہ نے خطبہ ارشاد فرمایا، اپنی رسالت کا اظہار کیا، اصلاحِ قوم کی چند تجویزیں پیش کیں اور پھر پکار کر کہا کہ تم میں کون ہے جو میرا رفیقِ عمل بنے، میرے مشن میں مجھے مدد دے اور اسکے صلے میں میرا جانشین خلیفہ اور وصی قرار پائے۔

کارلائل ہو یا ڈیون پورٹ، ابن خلدون ہو یا ابوالفدا، سب نے باختلافِ الفاظ اس تاریخی شہادت کو اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے[1]، رسُول اللہ نے ایک

---

[1] تاریخ طبری اور تاریخ کامل نے اس جلسے کا آخری منظر اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت رسولِ مقبول یہ فرما رہے تھے:-

فایکم یوازرنی
علی امری هذا و یکون
اخی و وصی وخلیفتی فیکم
فاحجم القوم عنها جمیعا
فقلت وانا احدثهم سناً

تم میں سے ایسا کون ہے جو اس امر میں میری وزارت کرے، میرا بھائی، وصی اور خلیفہ بنے، حضور کی اس تقریر کا کسی نے جواب نہیں دیا، (حضرت علی فرماتے ہیں کہ) میں نے باوجود سب کے کم سن ہونے کے

عام مجمع میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ جو جان اور مال سے میرے مشن کی اعانت کریگا وہی میرا جانشین اور خلیفہ ہوگا، شرائط بالکل کھلے ہوئے تھے جس کا دل چاہتا وہ اس رسول کی معاونت کا اقرار کرلیتا جس کا مشن ہنوز اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا، جس کی کامیابی مستقبل کے پردہ میں پوشیدہ تھی، جس کے گرداگرد ابھی مال غنیمت کے ڈھیر نہ لگے تھے۔

کارلائل کہتا ہے کہ مجمع پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، بعض مضحکہ خیز اشارے کرتے تھے، بعض کی پیشانیوں پر غور و فکر کی شکنیں نمایاں تھیں کہ یکایک ایک بچہ اُٹھا اور اُس نے دلیرانہ انداز میں کہا "یا رسول اللہ میں آپ کا معین و مددگار بننے کو تیار ہوں"۔ رسول اللہ نے فرمایا "بیشک تو ہی میرا وصی ہے میرا جانشین ہے، میرا خلیفہ ہے"۔ علیؑ اور رسولؐ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اُسکے شرائط کس خوبی سے پورے ہوئے اس کا جواب تو تاریخ ہی خوب

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

یا نبی اللہ انا وزیرك علیہ قال فاخذ برقبتی فقال ان ہذا اخی و وصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ و اطیعوا فقام القوم یضحکون و یقولون لابی طالب قد امرك ان تسمع لعلی وتطیع

عرض کیا یا نبی اللہ! اس کام کے لیے میں حضور کی وزارت کو حاضر ہوں یہ سن کر جناب رسول مقبول نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر فرمایا، یہ میرا بھائی میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے تم سب اس کا حکم سنو اور اطاعت کرو یہ سنتے ہی لوگ قہقہہ لگا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ابو طالب سے کہنے لگے کہ تم کو حکم دیا گیا ہے کہ علی کی فرمانبرداری اور اطاعت کرو۔

دے سکتی ہے، ہاں اتنا ہمیں بھی معلوم ہے کہ علیؑ نے جو عہد[1] کیا تھا وہ پورا کر کے دکھا دیا، وہ ہر مصیبت اور آفت میں پیغمبرِ اسلام کے ساتھ رہے اور جب تک اس آفتابِ رسالت کو قدرت نے مستور نہ کر دیا علیؑ نے اُس سے جدائی اختیار نہ کی، وہ اُس وقت بھی جسدِ[2] رسولؐ کے قریب موجود تھے جب وہ حجرۂ سیدہ عائشہ میں بے روح ایک بوریہ پر پڑا تھا، انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اُس مجسمۂ رسالت کو قبر میں اُتارا اور اپنے ہی ہاتھوں سے تہ خاک پوشیدہ[3] کیا، بے شک عروجِ اسلام کے دنوں میں علیؑ کی جانفروشیاں تاریخ اسلام کے بہترین ابواب ہیں، لیکن ہم اُنکو

---

[1] استیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں امام ابو عمر یوسف بن عبد البر تحریر فرماتے ہیں :-

عن ابن عباس قال لعلی اربعة خصال لیست لاحد غیرہ هو اول عربی وعجمی صلی مع رسول الله صلعم وهو الذی کان لواءہ معه فی کل زحف وهو الذی صبر معه یوم فرعنه غیرہ و هو الذی غسله وادخله فی قبرہ

"عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے کہ علیؑ کو چار خصوصیتیں ایسی حاصل تھیں کہ ہم میں سے کوئی اُس میں حصہ دار نہیں، (۱) کل عرب و عجم میں علی ہی وہ شخص ہیں جن کو سب سے پہلے رسول مقبول کے ساتھ نماز پڑھنے کا شرف ملا، (۲) ہر معرکۂ جنگ میں لوائے نبوی ان کے ہاتھ میں رہا، (۳) جب لوگ لڑائیوں میں رسول مقبول کو چھوڑ کر بھاگ گئے تو آپ اُن کی رفاقت میں ثابت قدم رہے۔ (۴) آپ ہی نے رسول مقبول کو غسل دیا اور قبر میں اُتارا"

[2] طبقات ابن سعد میں ہے :-

قبض رسول الله وراسه فی حجر علی

جب رسولؐ نے وفات پائی تو اُن کا سرِ مبارک علیؑ کی آغوش میں تھا۔"

[3] ایڈورڈ گبن اپنی مشہور تاریخ "زوال سلطنت روما" جلد ۵ میں یہ شمار فرماتے ہیں۔ "بیشک وہ تصفیے کر کے تجہیز و تکفین تک آخری لمحہ تک سب ہمراہیان وہ تھے کبھی رسول اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آنحضرت آپ کو انت اخی فی الدنیا والآخرۃ وخلیفتی من بعدی، انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ کہتے اور خوش ہوتے تھے۔

تو نظر انداز کئے دیتے ہیں ہم کو تو صرف یہ دکھلانا ہے کہ وہ رسول کی دن دونی ترقی دیکھ کر ان پر ایمان نہ لائے تھے اور ان کو بستر مرگ پر بے بسی کی حالت میں پڑا دیکھ کر[1] "ان ھذا الرجل لیھجر" کہہ کر نہ بھاگ گئے تھے، وہ اس وقت بھی میدان احد[2] میں ڈٹے رہے جب لوگوں نے قد قتل رسول اللہ کی آوازیں بلند کر دی تھیں اور ان کی پیشانی پر اس وقت بھی شکن نہ آئی جب[3] عمرو ابن عبدود کے مقابلے میں ان کو یکہ و تنہا نکلنا پڑا، اور کتنے مشق بہادر کھڑے دیکھتے رہے۔

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل اور صحیح مسلم شریف میں لکھا ہے:۔

عن سعید ابن جبیر عن ابن عباس انہ قال یوم الخمیس وما یوم الخمیس ثم جعل تسیل دموعہ حتی رأیت علی خدیہ کانھا نظام اللؤلؤ قال قال رسول اللہ صلعم ایتونی بالکتف والدوات او اللوح والدواۃ اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فقالوا ان رسول اللہ یھجر	"سعید بن جبیر روای ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس یہ کہہ کر کہ پنجشنبہ آہ پنجشنبہ کس مصیبت کا دن تھا اتنا روئے کہ موتیوں کی لڑی کی طرح آنسو ان کے رخساروں پر جاری ہو گئے پھر انہوں نے فرمایا کہ پنجشنبہ وہ دن تھا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا تھا کہ مجھے سامان تحریر لاؤ کہ میں تمہارے لیے ایسا نوشتہ لکھ دوں کہ تم میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو مگر بعض لوگوں نے کہہ دیا کہ آنحضرت ہذیان بک رہے ہیں۔

صحیح بخاری میں بھی باختلاف الفاظ یہی حدیث موجود ہے۔
شہاب الدین خفاجی کتاب نسیم الریاض شرح شفائے قاضی عیاض میں لکھتے ہیں کہ:۔

وفی بعض طرق ھذا الحدیث قال عمر ان النبی لیھجر	اور اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ نبی ہذیان بک رہے ہیں

شہرستانی نے کتاب ملل و نحل میں لکھا ہے کہ جب رسول مقبول نے دوات قلم اور کاغذ مانگا تو حضرت عمر نے فرمایا:۔

ان رسول اللہ قد غلب الوجع حسبنا کتاب اللہ	رسول اللہ پر مرض کا غلبہ ہے ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔

[2] تاریخ کامل ابن اثیر میں ہے کہ جب جنگ احد میں سب لوگ رسول اللہ کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور صرف حضرت علی مردانہ وار لڑتے رہ گئے تو ہاتف غیبی نے یہ ندا دی لا فتی الا علی لا سیف الا ذو الفقار (ترجمہ) علی کی طرح کوئی بہادر نہیں اور ذو الفقار کی طرح کوئی تلوار نہیں۔

[3] تاریخ خمیس، ابو الفدا۔

یاد رکھو کہ پیغمبرِ اسلام دُنیا میں کسی سلطنت کی بنیاد رکھنے نہیں آئے تھے، وہ اپنے بعد تاجداروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، اُن کا مشن یہ نہ تھا کہ پرائے اندوختہ کو لوٹ کر اپنے گھر میں بھر لیا جائے اور کمزور ملکوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر غلاموں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، وہ امنِ عامہ کے لئے خطرہ نہ تھے، وہ کسی خاص قوم یا ملک کے مفاد کے لئے نہیں آئے تھے۔

"تاجدار اور رعایا" دراصل ایک ایسا تخیل ہے جو رسولِ اسلام کے ذہن میں کبھی نہ تھا، اُن کے نزدیک قوم کی نگرانی ایک مقدس فرض تھا جو قوم کے سچے سے سچے تجربہ کار مزدور کا حق تھا جس کے لئے نہ تخت کی ضرورت تھی، نہ تاج کی، نہ قصر کی نہ محلات کی، وہ پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر، جَو کی روٹیاں کھا کر، قوم اور ملت کی خدمت کر سکتا تھا، رسول اللہ خود مزدور تھے اُنھوں نے ساری عمر اپنی روزی اپنے آپ کمائی، اس مقدس عہدہ کے لئے بھی ان کی نگاہیں ایسی ہی ہستی کو ڈھونڈ رہی تھیں جو اُن ہی کی طرح اپنی مدد آپ کرنے والا ہو اُن کو بیت المال کے ٹکڑے کھانے والے عیش پسند کی ضرورت نہ تھی، وہ یہودیوں کے باغ میں پانی دینے والے مزدور کو چاہتے تھے، اگر شروع ہی سے رسول اللہ کی یہ خواہش عملی جامہ پہن لیتی تو اسلام آج اپنے مقدس اصول سے اسقدر بیگانہ نہ ہوتا۔

اس زبردست انسان کی زندگی جو تیرہ رجب کو مکہ میں پیدا ہوا پیغمبرِ اسلام کی تعلیم کا مکمل نمونہ تھی اُس نے آڑے وقت اسلام کی مدد بھی کی (صرف زبان اور

قلم ہی سے نہیں بلکہ قوت اور شجاعت اور تلوار سے بھی) اور جب دُنیائے اسلام جارحانہ اقدام کے درپے ہو گئی تو گھر میں[1] گوشہ نشین ہو کر مجبور رہا۔

وہ جو جنگِ خیبر کا ہیرو (صلعم لکھا) تھا اظہارِ حق و صداقت کی پاداش میں حکومتِ وقت کے سامنے رسن بستہ بھی پیش ہوا، جس نے اس جہالت کے دور میں انسانی فرائض اور حقوق کا بنیادی پتھر رکھا، سرمایہ داروں کے ہاتھوں خود اپنے جائز حقوق سے محروم بھی کر دیا گیا، لیکن اس کی خدمات تلی کسی شکریہ یا انعام کی خواہش پر مبنی نہ تھیں، اُس نے اپنے زبردست کمالِ علمی سے دوست اور دشمن سب کو فائدہ پہونچایا، گو "مسندِ قضا" اُسے نہ ملی، لیکن اُسکے عہدِ زندگی کے تمام اہم قضیے اسی کی قوتِ فیصلہ کے رہونِ منت بنے، اور گو "نگرانیِ ملت" کا مقدس فرض براہ راست اُسکے سپرد نہ کیا گیا ہو، لیکن ایک سے زیادہ مرتبہ حکومتِ وقت

---

[1] اسلام مدافعانہ جنگوں کا حامی ہے، حصولِ جاہ و زر یا توسیعِ سلطنت کیلئے کسی ملک پر چڑھائی کرنا، یا تبلیغ دین کے بہانے سے کسی قوم کے خرمنِ آزادی میں آگ لگا دینا آئینِ قرآن کے خلاف ہے حضرت علی کی شجاعت مسلم الثبوت ہے، دورِ رسالت میں وہ ہر جنگ میں آگے آگے رہے، مگر رسول کی آنکھ بند ہوتے ہی انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، ظاہر ہے کہ شجاعت و قوت علی کا ساتھ نہ چھوڑ گئی تھی اور ان کے دست و بازو رسالت کے بعد شل نہ ہو گئے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم شام و ایران کی فتوحات کے سلسلے میں ان کا نام نہیں سنتے، ہاں اپنے عہدِ خلافت کی مدافعانہ جنگوں میں بھی وہ فوجوں کی قیادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محمد و آلِ محمد کی سیرت کا گہرا مطالعہ صاف طور سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ یہ حضرات مذہب کی آڑ لے کر زرخیز علاقوں کی تسخیر اور بلا ضرورت خونریزی کو مستحسن نہ سمجھتے تھے، یہ سختی کے ساتھ اس عقیدے پر قائم تھے کہ ایک قوم دوسری قوم کو غلام بنانے کا حق نہیں رکھتی، تلوار صرف دفاع کے لیے بلند ہوتی ہے، اور اسی وقت تک بلند رہتی ہے جب تک فتنہ و فساد فرو نہ ہو جائے، دین تلوار کے زور سے نہیں پھیلتا، وہ انسانی دل و دماغ سے براہ راست اپیل کرنے کی چیز ہے، اور سچ بھی ہے جو دین نوکِ شمشیر سے پھیلے وہ دینِ خدا کہاں رہا، وہ تشدد اور نازیت کا ہم ردیف ہو گیا۔

مع اپنے تمام ساز و سامان کے شورہ طلبی کے لیے اُس کے دروازے تک آ ئی، اور کبھی کسی یہودی کے کھیت میں، کبھی کسی باغ کے احاطے میں اُسے مزدوری کرتے ہوئے پایا۔

آہ! وہ ہاتھ جو عنانِ سلطنت سنبھالنے کے قابل تھے کدال زنی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے، وہ قیمتی وقت جو نشرِ علوم میں صرف ہونے کے لیے تھا، زمانے کی ناقدری نے "کسبِ معاش" میں خرچ ہونے دیا، سرمایہ پرست اور جاہ پسند لوگوں کی نگاہیں جب علیؑ کے علم و فضل، زہد و ورع، شجاعت و سخاوت میں کوئی عیب نہیں پاتیں تو ان پر سیاست سے ناواقفیت "طریقِ جہانبانی" سے نابلدی کا الزام لگاتی ہیں، گویا اُن کے نزدیک رسول اللہ کے جانشین کے لیے پرائے ملکوں پر چڑھائی کرنا، دنیا بھر کے مال کو لوٹ کر عسرت میں ڈالنا ایسا ہی ضروری ہے، جیسا آفتاب کے لیے حرارت اور برف کے لیے برودت، اُن سے کہہ دو کہ علیؑ چنگیز خاں[1] اور ہلاکو خاں کی سنّت کا احیا کرنے کے لیے نہیں بلکہ "رحمۃ للعالمین" کے اسوۂ حسنہ کو رواج دینے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔

ہم مانتے ہیں کہ وہ اس سیاست اور ڈپلومیسی سے جو مکاری اور ابلہ فریبی

---

[1] چنگیز خاں اور ہلاکو خاں دو تاتاری بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے اسلامی دنیا کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ اور جن کے ظلم و ستم کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔

کے مہذب نام ہی سے بہت دُور تھے[1]، ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کا عہدِ حکومت ان نام نہاد فتوحاتِ اسلام اور تسخیرِ ممالک سے خالی رہا، جنھوں نے چاندی اور سونے کے درمیان تمیز نہ کرنے والے عربوں کو دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار قوم بنا دیا، لیکن یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے علیؑ کو اپنے وقت کا سب سے بڑا انسان ثابت کر دیا، "آنچہ در اسلام فخر تست آں ننگ من است" علیؑ کا سب سے بڑا دشمن بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی حکومت کے زمانے میں "آئینِ محمدی" اور "شرعِ الٰہی" سے ایک انچ بھی ہٹے ہوں، تم شوق سے علیؑ کو "ناکام خلیفہ" کہو، لیکن یاد رکھو کہ تم علیؑ کو ناکامیاب کہہ کر "آئینِ محمدی" اور "شرعِ الٰہی" کا دیوالہ نکال رہے ہو، کیا علیؑ اس لیے انتظامِ سلطنت نہ کر سکے کہ وہ تقسیمِ حصص میں اپنے بھائی عقیل کا بھی پاس نہ کرتے تھے، کیا وہ اس لیے حکومت کے نااہل ٹھہرتے ہیں کہ وہ اپنے پیارے شاگرد عبداللہ بن عباس کی بھی رعایت نہیں کرتے تھے، اگر علیؑ کی ناکامی کا راز اُن کی پابندیٔ شرع ہی میں پوشیدہ ہے تو

---

[1] حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں :۔

واللّٰہ ما معاویۃ بادھیٰ منی ولکنہ یغدر ویفجر ولولا کراھیۃ الغدر لکنت من ادھی الناس۔
نہج البلاغہ

خدا کی قسم معاویہ کچھ مجھ سے زیادہ ہوشیار نہیں ہے مگر بات یہ ہے کہ وہ فسق و فجور اور دغا و فریب تک سے نہیں چوکتا، اگر مجھے دغا و فریب سے فطری نفرت نہ ہوتی تو تم دیکھتے کہ دنیا میں میرے برابر ایک بھی ہوشیار اور چالاک نہ نکلتا ......

(کیا کروں اصولِ اسلام پر جان دیتا ہوں، اخلاقِ حسنہ پھیلانے کے لیے آیا ہوں، عیاریوں اور مکاریوں کے ذریعہ سے دنیا کمانے نہیں آیا) نہج البلاغہ

پھر تم اُن کامیاب خلفاء کے لیے کیا کہو گے؟ کیا وہ شریعت کے پابند نہ تھے؟ کیا اُن کی سیاست قرآن سے الگ کوئی دوسری چیز تھی؟

مولانا شبلی سرمایہ پرستی کے نشہ میں اسلام کے ایک مشہور سیاست داں کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ

"جو ممالک اُن کے عہد میں فتح ہوئے وہ باوجود امتدادِ زمانہ مسلمانوں کے قبضے سے نہ نکل سکے۔" (دیکھو الفاروق)

شبلی! آج آپ ہوتے تو یہ دیکھتا کہ شام پر صلیبی جھنڈا لہرا رہا ہے، اور فلسطین کے قصرِ حکومت پر یونین جیک فراٹے لے رہا ہے، امام جعفر صادقؑ نے کیا خوب فرمایا تھا:-

"یہ دُنیا کی حکومت ہرجائی ہے، آج تیرے پاس ہو کل دوسرا اُس کا مالک ہوگا، ہم آسمانوں کے بادشاہ ہیں ہماری سلطنت لازوال ہے۔"

آج[1] بنی اُمیہ کے قصر میں فرانس کے شاطرانِ سیاست جلوہ آرا ہیں، بنی عباس کا دارالخلافت برطانوی وزیروں کا مسکن ہے لیکن علیؑ اور اولادِ علیؑ کی سلطنت آج بھی لازوال ہے۔

وہ سرمایہ دار بھی گزر گئے جو اپنے اپنے وقت میں کوسِ لمن الملک بجاتے تھے، اور مزدور بھی چل بسے جو محنت اور مشقت کر کے پیٹ پالتے تھے، اور

---

[1] یہ عبارت ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔

شب و روز تبلیغِ دین اور نشرِ علوم میں مشغول تھے، آج نہ وہ ایوان خالی ہیں، جہاں سلاطینِ اسلام رونق افروز تھے، نہ قید خانے جہاں وہ خدا کے مقدس بندے "جرمِ صداقت" کی پاداش میں بند رکھے جاتے تھے، ہاں تاریخ کے صفحات پر یہ فسانہ موجود ہے کہ جب تخت و تاج والے عاجز ہو جاتے تھے تو حلِ مشکلات کے لئے قید خانوں کے بسنے والوں کو دربارِ عام میں بلایا جاتا تھا، شبلی کہتے ہیں کہ "آلِ محمدؐ" نے جہانگیری اور جہانبانی کے سلسلے میں کوئی خدمت نہ کی، وہ سیلاب کی طرح افریقہ اور اندلس کی وادیوں کی طرف نہ بڑھے، فاطمی جھنڈا بحرالکاہل سے لے کر بحرِ ظلمات تک نہ لہرایا، اور میں خوش ہوں کہ آلِ محمدؐ کے فلسفے نے کوئی محمود غزنوی پیدا نہ کیا، جو سومنات کا مندر ڈھاتا، ان کی تعلیم کوئی محمد غوری پیدا نہ کر سکی، جو مقدس جنگ کا ہیرو بنتا، مذہب کی آڑ لے کر ان کی تلوار تسخیرِ عالم کا باعث نہ بنی، ہاں قید خانوں کی تاریک کوٹھریوں سے جو زبردست تبلیغ انھوں نے کی وہ آج کم و بیش آدم کے پانچ کروڑ فرزندوں کے لیے بہترین دستور العمل اور اعلیٰ نظامِ عمل بنی ہوئی ہے، تبلیغ کے لئے کبھی تلوار کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، حصولِ اسلام کو جبراً پھیلانے کا انھیں کبھی موقع تک بھی نہ ملا، لیکن خدایا! یہ کیا ہے کہ آج آلِ محمدؐ اور صرف آلِ محمد کے سچے فدائی، ان کے بتائے ہوئے قوانین کو باعثِ نجات سمجھنے والے شیعہ دنیا میں پانچ کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں، اور شکر ہے کہ یہ تعداد دنیا کے کسی اسلامی

فرق کم نہیں، سچ تو یہ ہے کہ اگر محمدؐ و آلِ محمدؐ کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو شبلی کے مایۂ ناز اسلام کی تاریخ چند جہانگیریت پسند سرمایہ داروں کا طویل افسانہ بن کر رہ جاتی، ان تاجداروں کی سیرت پر جو خمس اور زکوٰۃ کے اُس مال کو جو تمام دُنیائے اسلام کی مشترکہ ملکیت تھا "مے نوشی" کی نذر کر گئے، جنھوں نے ممالکِ مفتوحہ کے خراج سے عالیشان محلات کی بنیاد ڈالی، جو اسلام کی گردن پر اپنے عزیزوں، قریبوں اور ہم خیالوں کو سوار کر گئے، فخر کرنا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا ہے، انصاف سے دیکھو تو اسلام کے تمام نام نہاد سلاطین کا دَور "ہیبت اور تشدد" کا ایک تاریک ڈرامہ تھا جس میں بقولِ سفیان ثوری

"کتوں کے پیٹ پالے جاتے تھے مگر انسان کو امان نہ تھی"۔

بیشک دیگر مذاہب نے اس سے بھی زیادہ ظالم لوگ پیدا کیے لیکن اسلام سے جو "امنِ عامہ" کا حامی تھا، جو خدا کا آخری اور مکمل پیغام تھا، ہمیں ایسے ثمرات کی اُمید نہ تھی، ہم مانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ ان کے عہدِ حکومت میں امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان صرف معمولی اختلافِ عقائد کی بنا پر بے دریغ قتل کر دیئے جاتے تھے، مجوسیوں کے لیے دربار میں بڑے بڑے عہدے تھے اور مسلمانوں کے بہترین دماغ "نہیں نہیں امام" قید خانوں میں پڑے تھے۔

لیکن اے مولودِ کعبہ! اے ماہِ رجب کے بہترین ثمر! تیری اور تیری اولاد

کی جد و جہد تلواروں سے رُکنے والی اور قید خانوں کی چار دیواری میں بند ہونے والی نہ تھی، تو نے دُنیا کو بتا دیا کہ روحانی سلطنتوں کے تاجداروں کے سینے تیروں سے چھلنی اور زہر آلود انگوروں سے پاش پاش نہیں ہوتے، نعلبند گھوڑوں کی ٹاپیں اجسام نور کو پامال نہیں کر سکتیں، شاہوں کا جاہ و جلال اُصولِ مذہب پر غالب نہیں آسکتا۔

جب کبھی اسلام کے امن پسند قائدین اور سچے مبلغین کی تاریخ تیار ہوگی وہ تیری اور تیری اولاد کی زندگی کا حیرت انگیز افسانہ بن کر رہ جائے گی مبصرین عالم تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت حال کو دیکھ سکتے ہیں کہ سچی بانی حقیقی ایثار، علم و فضل، سخاوت اور شجاعت کی تصویریں جب کسی البم میں جمع کی جائیں گی تو وہ فاطمی خاندان کا مرقع بن کر رہ جائے گا، اگر محمدؐ و آلِ محمدؐ کی بے لوث اور بے غرضانہ خدمات اس میں شامل نہ ہوں تو اسلام قسمت آزما عربوں کے ایک حریصانہ منصوبے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تخت و تاج کے لالچ میں، اقتدار اور جاہ پرستی کی خاطر، خزانوں اور ملکوں کے حصول کے لیے کسی مذہب پر قائم رہنا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے، ہاں میدانِ کربلا میں بہتر کی قربانی چڑھانے کے بعد تین دن کی بھوک اور پیاس میں، دُنیاوی امداد سے مایوس ہو کر، مادی عیش و آرام سے محرومی حاصل کر کے، کسی مذہب پر قائم رہنا اور مرتے دم تک اُس کا دم بھرنا اُس مذہب کی صداقت کا بہترین

نشان ہے، کسی طالب تحقیق کے لیے بنی اُمیہ اور بنی عباس کے جاہ وجلال، انکی مے نوشی اور انکی سرمایہ داری میں اسلام سے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے، ہاں جب وہ دیکھتا ہے کہ مظلوم کربلا کا مظلوم فرزند دمشق کے شہر میں، یزید کے دربار میں اپنے کنبہ کو ساتھ لیئے رسن بستہ کھڑا ہے، دُنیا اور اُس کی تمام زینتیں اُس کے لیئے معدوم ہو چکی ہیں، اُمیدوں کی جگہ حسرت و یاس نے گھیر لیا ہے، تمام خاندان تباہ ہو چکا، اور مستقبل میں قید خانے کی زندگی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، خدا اور اُس کی آسمانی نصرت بھی بظاہر اُسکے ساتھ نہیں ہے وہ تمام قوم جس سے قدر دانی کی کوئی اُمید ہو سکتی تھی، جانی دشمن بنی ہوئی ہے، لیکن وہ ہے کہ قدم قدم پر خدا کا شکر بجا لاتا ہے، مایوسیوں کی کالی گھٹا میں بھی اُسے اُمید اور کامل اُمید کی ایک درخشاں شعاع نظر آتی ہے، وہ طوق و سلاسل اور قید خانہ کی تاریک کوٹھری میں بھی اپنی رُوح کو آزاد پاتا ہے، اور مصائب کی شدت صرف اُسکو مستقل مزاج بنانے میں مدد دیتی ہے، وہ سونے کی طرح تپ تپ کر نکھرتا ہے اور صندل کی طرح گھِس گھِس کر خوشبودار بنتا جاتا ہے، تو صبر و استقلال کی یہ زبردست نمائش اس طالب تحقیق کو حیرت و استعجاب کے دریا میں غرق کر دیتی ہے، اور وہ اسلام کی عظمت و شان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آلِ محمدؐ کی درد بھری کہانی حق و باطل کے متلاشی کیلئے ایک درس عبرت ہے

دیکھو اور غور سے دیکھو شمر و عمر تباہ ہو گئے، حرملہ کا کہیں پتا بھی نہیں، لیکن حسینؑ کے خون بھرے عمامے کی یادگار، علی اصغرؑ کے جھولے کا نشان آج بھی دُنیا میں موجود ہے، عباسؑ کا قاتل موت کی دستبرد کا شکار ہو گیا، مگر عباسؑ کا علم آج بھی اسلامی رگوں میں خون کو جوش میں لانے کے لیے منظرِ عام پر آتا ہے، زین العابدینؑ کو طوق و سلاسل پہنانے والے فنا کی آغوش میں چلے گئے مگر زین العابدینؑ کا طوق محرم میں سیکڑوں شہزادوں اور نواب زادوں کی گردن میں دکھائی دیتا ہے، دیکھو ذلت کے سامان اہلبیتؑ سے منسوب ہو کر عزت کا نشان بن گئے، کیا قدرت کا یہ صاف و صریح فیصلہ مادہ پرست دُنیا کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہے، مجھے بتاؤ کہ حسینؑ کی کربلا والی تین دن کی زندگی نے اسلام کی حقانیت کا جو ناقابلِ انکار ثبوت پیش کر دیا اور اس غم انگیز مصیبت نے تبلیغ کے جو عالمگیر سامان مہیا کر دیئے وہ اسلام کے نام نہاد سلاطین کی مجموعی تاریخ ہزار برس میں بھی پیش کر سکتی ہے ؟ اے بنتِ اسد کے لاڈلے! اے اسلام کے بہترین فرزند ! اے مادرِ عرب کے سپوت ! تیری زندگی اسلام کی صداقت کا سب سے بڑا معجزہ، تیری اولادِ طاہرینؑ کا اُسوۂ حسنہ شجرِ اسلام کا بہترین ثمر ہے، تیری بے پناہ تلوار نے اسلام کی جان بچائی اور تیرے عدیم النظیر کیرکٹر نے تبلیغ میں مدد دی، دُنیا کے لوگ اپنے بادشاہوں کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کرتے ہیں، اے فاقہ کش مزدور ! اے روحانیت کے شہنشاہ !

اپنے ایک مزدور فرزند "نہیں نہیں ادنیٰ غلام" کی طرف سے پیش کیا جانے والا "چند" کاغذی پھول، قبول فرما۔

اے مولودِ کعبہ! اے مدفونِ نجف! دُنیا آج تیرے کمال کے سامنے سر جھکا رہی ہے، تیرا زبردست مدبر با فوق العادت قابلیت آج مہذب دُنیا کے عقلمندوں کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے، کارل مارکس لینن اور ٹالسٹائی تیری شاگردی پر نازاں ہیں، نپولین اور ڈیوک آف ولنگٹن تیری جرأت اور بہادری کا لوہا مانے ہوئے ہیں، اے یہودیوں کے باغ میں چند مٹھی خرموں پر مزدوری کرنے والے! بالآخر تیرے فلسفۂ معاشرت کی فتح ہوئی، میں مستقبل کے پردے میں دُنیا کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور ہر چیز بہ قدم اسی آواز کی طرف بڑھ رہا ہے جو کبھی کوفہ کی مسجد میں گونجا کرتی تھی۔

اے حریت اور مساوات کے سب سے پہلے حامی! اے کھدر پوش لیڈر! اے غریبوں کے مددگار! ابدی اور کامل فتح تیرے ہی لیے ہے، تیرے حریفوں کے سر بفلک محلات نیست و نابود ہو گئے، مگر تیرے خس پوش جھونپڑے کا ذکر تاریخِ عالم کا ایک نمایاں باب ہے۔ تیرے عیش و عشرت کے متوالے رقیب نذرِ تغافل ہو گئے، مگر تیری فاقہ کشی کا بیان بھولے بھٹکے سازوں کے لیے اب تک منارۂ ہدایت ہے۔

اے مغربی ایشیا کی مقدس سرزمین پر پیدا ہونے والے! ایک ایشیائی کا مودبانہ سلام قبول کر۔

ارضِ نینوا پر فاطمی شہیدوں کی سرفروشیاں

فراتِ کے کنارے آلِ محمدؐ کا قتلِ عام

اسلام! اسلام!! میں اسلام کو کہاں تلاش کروں؟ کیا بنی اُمیّہ کے اُن سربفلک محلات میں جو قیصر و کسریٰ کے لیے باعثِ رشک تھے؟ یا عباسیوں کی اُن جواہر نگار عمارتوں میں جن کی تجلی آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دیتی تھی؟

اسلام! کیا تو "مقدس لڑائیوں" کے اُن میدانوں میں ہے جو مذہب کی آڑ لے کر ذاتی منافع کے لیے گرم کیے جاتے تھے؟ یا تیرا مقام اُن خزانوں کے اندر ہے جہاں مالِ غنیمت کے ڈھیر لگے رہتے تھے؟ میں نے ایک ایک کر کے سلاطینِ اسلام کے درباروں کو دیکھا، وہاں سونے اور چاندی کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، اُمرا اور وزرا قرینے سے اپنے اپنے مقام پر فروکش تھے، ملک ملک کے ایلچیوں کا ہجوم تھا، قسم قسم کی نادر چیزیں موجود تھیں، مگر اے اسلام! کونہ کونہ چھان ڈالا، چپہ چپہ ڈھونڈا، تیرا وہاں پتہ نہ چلا،

پھر کیا میں تجھکو واجب الاطاعت خلفا کے اُن خلوت خانوں میں تلاش کروں جہاں راجہ اندر کا اکھاڑا جمتا تھا، سیمیں تن اور آتشیں رخسار حسینوں کے ہاتوں سے شراب کے دَور چلتے تھے؟

اسلام! کیا تو "فوجوں کے اُس سیلاب" کے ساتھ تھا جو اسلام کا نام لے کر ملکوں کی دولت کو بہائے لیے جاتا تھا؟ کیا تو ان "مقدس لٹیروں" اور "مذہبی ڈاکوؤں" کی رہنمائی کر رہا تھا جنھوں نے مندروں کو ڈھایا، کلیساؤں کو لوٹا، آتشکدوں کو برباد کیا، اور امن پسند مخلوق پر عرصۂ زندگی تنگ کر دیا؟ میں نے برسوں تاریخ کی ورق گردانی کی اور تیرے اس نام نہاد ترقی کے فسانوں کو پڑھا، جو ایرانیوں کے کلیجے مسوس کر اور رومیوں کا صبر سمیٹ کر حاصل کی گئی تھی مجھے معلوم ہے کہ ملک پر ملک فتح کیے گئے، مفلس اور قلاش عرب ربانی دولت کے مالک بن گئے، مزدوری کی جگہ سرمایہ داری نے لی، سادگی جاہ و جلال سے بدل گئی، قرآنی تعلیم کو پس پشت ڈال دیا گیا، اور اسکی جگہ سیاست اور ڈپلومیسی شروع ہوئی، جو مکاری، دغا بازی اور شرارت کا مہذب نام ہے، دُنیا بھر کی دولت سمٹ سمٹ کر مرکز خلافت میں جمع ہو گئی اور مذہب "قسمت آزما بہادروں کا تختۂ مشق بن کر رہ گیا، شاہ وقت کی سیہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے وقدر خیرہ وشرہ من اللہ کا مضحکہ خیز نظریہ بنایا گیا اور رفتہ رفتہ مجبوریہ فرقہ کی بنیاد پڑی۔

پس اے اسلام! کیا میں تجھکو اُن تاجداروں کی محفل میں ڈھونڈوں جن کا وجود دُنیا کے لیئے "بلائے بے درماں" تھا، جو کتّوں کا پیٹ پالتے تھے، مگر انسانوں کو ان کے ظلم سے امان نہ تھی، جو انواع واقسام کے کھانے کھاتے تھے، بیش بہا لباس پہنتے تھے اور پھولوں کی سیجوں پر سوتے تھے، حالانکہ خدا کی مخلوق فاقہ کشی میں مبتلا تھی، تن پوشی کے لیئے ترستی تھی، اور اُس کو بستر خاک پر بھی چین سے سونا نصیب نہ تھا۔

میں نے ہر طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا، پائینز عظمیٰ سے لے کر چین تک، سائبیریا سے لے کر جزائر بحرالہند تک، مگر تیرا پتہ ان خس پوش جھونپڑیوں کے سوا کہیں نہیں ملا جن میں رسولِ عربی اور اُن کے فاقہ کش جانشین اپنی زندگی کی بیش قیمت ساعتیں گزارتے تھے، ہاں ہاں! تیری اصلی روشنی میں نے اُن تاریک کوٹھریوں سے نکلتے ہوئے دیکھی جہاں فاطمہؓ کی پیاری اولاد "حق وصداقت" کی تبلیغ کے جرم میں قید رکھی گئی، تیری اشاعت ہمیشہ مزدوروں کی رہینِ منت رہی، عبداللہ کے یتیم بچے کے منہ سے "نجاتِ ابدی" کا جو محبت بھرا پیام نکلا تھا، اُس کو سرمایہ داروں اور تیغ آزماؤں نے نہیں بلکہ فاطمہؓ کی گود کے پلے ہوئے مزدوروں نے دُنیا کے گوشے گوشے میں پہونچایا۔ کربلا کا "تاریخی" "میدانِ جنگ" اس نہ مٹنے والی صداقت کا ایک روشن نشان ہے۔

دُنیا نئے نئے رنگ بدلتی رہے گی، سیکڑوں لڑائیاں ہونگی، ہزاروں

ہنگامے برپا ہونگے، ظالم بھی پیدا ہونگے اور مظلوم بھی، مگر آج سے تیرہ سو سال قبل "ارضِ نینوا" پر بنی فاطمہؑ کی تباہی کا جو دردانگیز منظر پیش آچکا، عالم اُسکی نظیر نہ پیدا کر سکے گا۔

رسولِ کریم کے بعد عرب کے سیاست دانوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بنی ہاشم کو ہمیشہ امورِ سلطنت سے علیحدہ رکھا جائے اور اگر ممکن ہو سکے تو دشمنوں کو ان کے سر پر مسلط کر کے ان پر عرصۂ زندگی تنگ کر دیا جائے۔ "سیاستِ عرب" کا یہ فتنہ خیز اور تباہ کن نظریہ تا قیامت مسلمانوں کو خون کے آنسو رلائے گا۔

نام نہاد مدبرینِ عرب کے خود غرضانہ رویہ نے "سلطنت" کو جس ڈھچر پر ڈال دیا تھا، اور "خلافت" کے انتخاب میں غلط کار اور غیر انجام بیں انسانوں کی مداخلت کو جس آسانی کے ساتھ قبول کر لیا گیا تھا، اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یزید جیسا شراب خوار، بداخلاق اور نامعقول انسان رسولِ اسلام کا جانشین اور مسلمانوں کا امیر کہلائے۔ حق یہ ہے کہ یزید نے تاجدارِ عرب بن کر ان تمام خود ساختہ اصول کے چہرے سے نقاب اُلٹ دی، جو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانیوالے انسانوں نے اپنی غلطیوں کو چھپانے کے لیے بنا لیئے تھے،

"سیاست داں باپ" اپنے مربیوں مسلمہ کی حکمتِ عملی سے واقف تھا، وہ مرتے دم تک کہتا رہا "بیٹا سب کچھ کرنا مگر حسینؑ ابن علیؑ سے کھلم کھلا نبرد آزمائی نہ کرنا"، یزید ارادے کا پختہ اور معاملے کا صاف تھا، وہ اپنے

باپ کی طرح یہ Underhand Policy منافقانہ حکمت عملی کا قائل نہ تھا، اُس نے اپنی خاندانی اور ملکی روایات کے خلاف امام حسین علیہ السلام کو کھلم کھلا چیلنج (اعلانِ جنگ) دیا، اور گو اُسکے غیر معقول "اقدام" کے نتائج مابعد خود اسکے حق میں مضر ہوئے، مگر دُنیا کو ایک مرتبہ اس سازش کا پتہ لگ گیا جو آلِ محمدؐ کے خلاف مُدت سے تیار کی جا رہی تھی۔

چوتھائی صدی کے تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ آلِ محمدؐ کو سلطنت اور حکومت کی خواہش نہیں ہے، ان کا وجود شاہِ وقت کے خلاف کسی کارروائی کا مرکز نہیں بن سکتا، وہ اس فانی دُنیا کی عزت کے خواہاں نہیں، اور سچ یہی ہے کہ رسول اللہ کے روضے کا وہ بے کس و بے یار مجاور جس کو تین تین دن تک نصیب نہ ہوتی تھی، جو دُنیاوی جاہ و جلال اور مال و منال سے بالکل محروم تھا، جو پھٹے ہوئے بوریے پر نماز پڑھتا اور پیوند لگے ہوئے کپڑے زیب تن کرتا تھا، جسکے پاس نہ فوج تھی، نہ لشکر، نہ ملک تھا نہ خزانہ، بھلا ایسا شخص کسی بادشاہ کے لئے کس طرح سیاسی خطرے کا باعث ہو سکتا تھا؟ ہاں ایک بات تھی جس کا علاج امام حسینؑ کے پاس نہ تھا۔ اُن کی روحانی شخصیت، ان کا خاندانی اقتدار، ان کا علمی تفوق خود اپنے اندر ایسی کشش رکھتا تھا جو بادشاہوں کو باوجود اپنی سلطنت کے میسر نہ آیا، اور یہی ایک وجہ تھی کہ اُن کا وجود ہمیشہ شاہانِ وقت کی نگاہوں میں کھٹکتا رہا۔

افق اسلام پر جور و استبداد کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں، حق اور صداقت کا خاتمہ ہو رہا تھا، ایک ننگِ انسانیت "رسولِ عربی" کی عمر بھر کی کمائی کو خاک میں ملانے کے لئے تیار تھا، فتنہ و فساد کی آگ تھی جو جزیرہ عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھڑک رہی تھی، صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم کا تخت ایک ایسے شخص کے قبضے میں تھا جو کتاب اور سنت کا دشمن، کفر و نفاق کا حامی اور سیر و شکار کا شائق تھا، وہ نماز پڑھتا تھا مگر شراب پی کر، نکاح کرتا تھا مگر ماں اور پھوپھیوں سے۔

"سیاستِ عرب" رفتہ رفتہ ان نتائج پر پہونچ گئی تھی جن کی اس کو مدت سے تمنا تھی، اجماع، اختلاف اور شوریٰ کی اجتماعی قوتیں ایک ایسی ہستی کو منظرِ عام پر لے آئی تھیں جس نے تاریخِ عالم میں اسلام کو بدنام کر دیا۔

مسلمانوں کا یہ لاڈلا خلیفہ ان تمام خصائل کا مجموعہ تھا جو انسان کو حیوانیت کے درجے تک پہونچا دیتے ہیں، وہ بے رحم، اجڈ، چپٹہ، فتنہ جو، سب کچھ تھا، مگر قدرت نے اس کو بلاکی "اخلاقی جرأت" دی تھی، وہ شراب کو "نبیذ" کہہ کر نہیں پیتا تھا، وہ اپنے مخالف کو قتل کرنے کا حکم دیتے وقت اس پر جھوٹے الزام لگانے کا عادی نہ تھا، وہ اپنے کفر کو اسلام کا جامہ پہنانا نہیں چاہتا تھا، اس نے بھرے دربار میں اپنے عقائد کا اظہار کر دیا ہے

لعبت بنو هاشم بالملك فلا ۔ ملک جاء و لا وحی نزل[1]

جب کفر عریاں ہو کر میدان میں آگیا، اور مسندِ خلافت سے اسلام کو چیلنج دینے لگا، تو رسول اللہ کے نواسے علیؑ مرتضٰے کے فرزند فاطمہؑ کی گود کے پالے نے اپنے لئے دو ہی راستے کھلے ہوئے پائے، "ذلت کی زندگی یا عزت کی موت" انھوں نے آخری راستہ اختیار کر لیا، وہ گھر سے نکلے، فوجیں لے کر نہیں، بلکہ اہل و عیال کے ساتھ، لڑنے کے لئے نہیں، بلکہ مرنے کے ارادے سے، ان کی منزلِ مقصود وہ "شہد اور دودھ" کا ملک نہ تھا جس کا موسیٰ سے وعدہ کیا گیا تھا؛...... وہ "چرخِ چہارم" تک رفعت پانے کے امیدوار نہیں بنائے گئے تھے، اُن کے سامنے "موت و تباہی" "مسافرت و تنہائی" "بربادی اور تاراجی" کے وہ روح فرسا مناظر تھے جن کا خیال ہی انسان کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہے، لیکن خوف، حزن اور ملال ایسے الفاظ تھے جن کا حسینؑ کی ڈکشنری میں نام و نشان

---

[1] مشہور سنی عالم ملا معین فرنگی محلی نے ان تمام اشعار کو اپنی کتاب وسیلۂ نجات میں نقل کیا ہے، یہ اشعار نصائح کافیہ، اور صواعق محرقہ میں بھی موجود ہیں۔

لیت اشیاخی ببدر شهدوا	جزع الخزرج من وقع الاسل
لاهلوا واستهلوا فرحا	ثم قالوا یا یزید لا تشل
وقد قتلنا القرن من ساداتهم	وعدلنا قتل بدر فاعتدل
لست من عتبة ان لم انتقم	من بنی احمد ما کان فعل
لعبت هاشم بالملك فلا	نبی جاء ولا وحی نزل

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے "کہ کاش آج میرے بدر میں قتل ہونے والے بزرگ ہوتے تو خوش ہو کر مجھے داد دیتے، ہم نے بنی ہاشم کے ایک بڑے سردار کو قتل کرا دیا، اور بدر کے دن کا بدلہ لے لیا، اگر میں آلِ محمدؐ سے اس طرح انتقام نہ لیتا تو عتبہ (یا خندف) کی نسل میں شمار نہ ہوتا، یہ تو بنی ہاشم کا ڈھونگ تھا ورنہ کیا نبی اور کیسی وحی۔"

بھی نہ تھا الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون

انھوں نے اسلام کی خاطر اپنی اور اپنے رفقا کی ہستی کو خطرے میں ڈال دیا، اور فرات کے کنارے حق و باطل، کفر و اسلام، استبداد و حریت، سرمایہ و مزدوری کی یادگار جنگ کا نقشہ پیش کر کے دنیا کو بتا گئے کہ ابدی فتح نہ اسلحہ کی محتاج ہے نہ کثرتِ افواج کی، وہ اصول کی صداقت، ارادے کی مضبوطی اور قوتِ ایثار سے حاصل ہوتی ہے۔ اسلام، رسول کا پیارا اسلام، "قربان گاہِ سیاست" پر نثار ہو کر رہ جاتا اگر فاطمہ کا فرزند اپنی جان پر کھیل کر اس کی حفاظت نہ کرتا۔

یزید نے اس تیار شدہ "ڈرامے" کو اسٹیج پر جگہ دے دی جو مدت سے پس پردہ وقت اور موقع کا منتظر تھا، وہ اس "کتابِ سیاست" کے احکام کو عملی جامہ پہنا گیا جو اگلوں[1] نے پچھلوں کے لیے تیار کی تھی۔ دشمنانِ اسلام کے

---

[1] علامہ مسعودی اپنی تاریخ مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ جب امیر معاویہ نے حضرت علی کے خلاف بغاوت کی اور صفین کے میدان میں فریقین کے لشکر صف آرا ہونے لگے تو حضرت محمد ابن ابی بکر نے امیر معاویہ کو ایک خط لکھا جس میں حضرت علی کے فضائل بیان کر کے معاویہ کو بغاوت پر ملامت کی، اس کے جواب میں امیر معاویہ نے حسب ذیل خط روانہ کیا۔

من معاویة بن صخر الی الزاری علی ابیه محمد ابن ابی بکر، اما بعد فقد اتانی کتابک تذکر فیه ما الله اهله فی عظمته و قدرته و سلطانه و ما اصطفی به رسول الله صلعم مع کلام کثیر لک فیه تضعیف ولابیک فیه تعنیف ذکرت

معاویہ کی طرف سے اپنے باپ کو عیب لگانے والے محمد ابن ابی بکر کے نام، واضح ہو کہ تم نے اپنے خط میں خدا کی اس عظمت، قدرت اور حکومت کا ذکر کیا ہے جس کا وہ اہل ہے اور ان (صفات) کو بیان کیا ہے جن کے ساتھ اس نے اپنے رسول کو برگزیدہ کیا، اس کے ساتھ ہی ساتھ تم نے بہت سی باتیں لکھی ہیں کہ وہ خود تمہاری کمزوری اور تمہارے باپ کی ملامت کا باعث ہیں، تم نے

(آئندہ صفحہ)

ترکش کا یہ آخری تیر تھا جو ترازو ہو گیا، اور عربی ماریوں کا یہ آخری تماشا تھا، جو

(بقیہ صفحہ گزشتہ) فیه فضل ابن ابی طالب وقدیم سوابقه وقرابته الی رسول الله صلعم ومواساته ایاه فی کل هول وخوف فکان احتجاجك علیّ وعیبك لی بفضل غیرك لا بفضلك فاحمد ربا صرف هذا الفضل عنك وجعله لغیرك فقد کنا وابوك فینا نعرف فضل ابن ابی طالب وحقه لازمًا لنا مبرورًا علینا فلما اختار الله لنبیه علیه الصلوٰة والسلام ما عنده واتمّ له ما وعده واظهر دعوته فابلج حجته وقبضه الله الیه کان ابوك وفاروقه اول من ابتزه حقه وخالفه علی امره علی ذٰلك اتفقا واتسقا ثم انهما دعواه الی بیعتهما فابطا عنهما فهما به الهموم وارادا به العظیم ثم انه بایعهما وسلم لهما واقاما لا یشرکانه فی امرهما ولا یطلعانه علی سرهما حتی قبضهما الله ثم قام ثالثهما عثمان فهدی بهدیهما وسار بسیرهما فعبته انت وصاحبك حتی طمع فیه الاقاصی من اهل المعاصی فطلبتما له الغوائل واظهرتما عداوتکما حتی بلغتما فیه مناکما فخذ حذرك یا ابن ابی بکر

اس خط میں علی ابن ابی طالب کی فضیلت اور سابقیت کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی دکھایا ہے کہ وہ رسول اللہ کے قریبی عزیز تھے اور انھوں نے ہر خوف کے مقام پر آنحضرت کی ہمدردی اور مدد کی مگر یہ احتجاج اور عیب چینی جو تم نے کی ہے وہ اپنی نہیں بلکہ دوسرے کے فضائل کے بل بوتے پر ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے فضائل کا رُخ تمھاری طرف سے دوسرے کی طرف موڑ دیا، (واضح ہو کہ) ہم سب جن میں تمھارے والد (ابوبکر) بھی شامل تھے علی کے فضل و شرف سے واقف تھے اور ان کے حقوق کو لازم اور ضروری سمجھتے تھے مگر جب خدا نے دین و ملت کے کامل و مکمل ہونے کے بعد اپنے رسول کو اپنے پاس بلا لیا تو تمھارے باپ اور اُن کے دوست فاروق ہی پہلے وہ شخص تھے جنھوں نے باہم اتفاق کر کے علی کا حق چھین لیا، اور امر خلافت میں اُن کی مخالفت کی، پھر دونوں نے علی کو بیعت کرنے کی دعوت دی مگر وہ عرصہ تک کنارہ کش رہے، اور (اس کنارہ کشی پر) دونوں صاحبوں نے ان کے خلاف بڑے بڑے منصوبے کئے، (یہاں تک کہ) علی نے بیعت کی اور صلح کر لی، پھر بھی ان دونوں بزرگوں نے علی کو نہ اپنے کسی امر میں شریک کیا نہ اپنے رازوں کی اطلاع دی، یہ دونوں رحلت کر گئے تو تیسرے عثمان ان کے قائم مقام ہوئے اور پہلے دونوں کی سیرت پر عامل رہے تم نے اور تمھارے آقا علی نے کھلم کھلا عثمان کے ساتھ دشمنی کی اور اُن کو بلاؤں میں ڈالنا چاہا، یہاں تک کہ تمھاری مراد بر آئی، اے ابوبکر کے بیٹے ہوشیار رہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کامیاب ثابت ہوا، لیکن نہ یزید اپنے چلانے والے کا بنایا ہوا تھا، نہ اس تماشے کے تمام اجزا اس مداری کے تیار کردہ تھے۔ یزید تو اس مشین کا فقط ایک پرزہ تھا جو دنیائے اسلام کو کفر کی طرف اڑائے لیے جا رہی ہے، حسینؑ کی زندگی اور موت کا یہی مقصد تھا، کہ اسلام زندہ رہے اور مسلمان دنیا و آخرت میں مدارج عالیہ پر فائز ہوں، حسینؑ کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور ان کی شہادت نے ایک ایسی آگ روشن کر دی جس نے ایک طرف تو کفر و استبداد کو جلا کر خاکستر کر دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کے لیے منارۂ ہدایت کا کام دیا، بنی امیہ کو اپنی ڈپلومیسی پر ناز تھا اور آج بھی ان کے ہوا خواہ ان کی اس صفت کو بار بار زبان پر لاتے ہیں، شبلی اور ان کے متبعین کے قلم کی ہر گردش دشمنانِ اہلبیت کی سیاست دانی کا راگ الاپتی ہے، لیکن ان کوتاہ بینوں کی نگاہیں اس

(بقیہ صفحہ گزشتہ) وقمص شبرك بعد تركه وقصر عن ان تناله او تساوی من يزنه الجبال بحلمه فان يك ما نحن فيه صوابا فابوك استبد به ونحن شركاؤه ولولا ما فعل ابوك من قبل ما خالفنا ابن ابى طالب وتسلمنا اليه ولكنا رأينا اباك فعل ذالك به من قبلنا فاخذنا بمثله فعب اباك وابدالك اودع ذالك والسلام

اور مقدار کے مطابق پاؤں پھیلاؤ، (لفظی ترجمہ۔ اپنے بالشت کو انگوٹھے اور انگلی کی درمیانی وسعت پر قیاس کرو) تو اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کے حلم کا تقابل پہاڑ ہی کر سکتے ہیں پس یہ معاملہ زیر بحث اگر درست اور ٹھیک ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو تمہارے باپ نے اس کی ابتدا کی۔۔۔ ہم بھی ان کے شریک کار رہے، اگر تمہارے والد نے پہلے ایسی بنیاد نہ رکھی ہوتی تو ہم علی ابن ابی طالب کی مخالفت نہ کرتے اور خلافت ان کے سپرد کر دیتے مگر جب ہم نے تمہارے باپ کو یہ کرتے ہوئے دیکھا تو ہم نے بھی ان کی تقلید کی، پس اگر تم عیب لگاتے ہو تو اپنے باپ کو لگاؤ ورنہ یہ بات چھوڑ دو۔ والسلام"

عظیم الشان تدبر پر نہیں تھیں جس نے دنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، حسینؑ بے شک قتل کئے گئے، ان کا خاندان تباہ ہو گیا، لیکن اس تباہی سے وہ نتائج پیدا ہوئے جنھوں نے بنی امیہ کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور "اہلبیتؑ" کے فلسفہ کو کامیابی کی ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا، جن لوگوں نے انقلاب فرانس اور انقلاب روس کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ تعجب کرینگے کہ حسینؑ نے ۱۰ محرم کے چند گھنٹوں میں تمام دنیائے اسلام کو انقلاب کے جراثیم سے کس طرح متاثر کر دیا۔

رسول اللہ کے بعد جو ممالک فتح ہوئے تھے ان میں سے عراق کو چھوڑ کر قریب قریب تمام ممالک آلِ محمدؐ اور ان کے فلسفے سے بے خبر تھے، اور شام کا تو یہ حال تھا کہ وہاں کوئی آلِ محمدؐ کے نام سے بھی واقف نہ تھا، ان کے نزدیک رسول اللہ کے عزیز قریب جو کچھ تھے وہ معاویہ اور ان کی اولاد ہی تھی۔

مروج الذہب مسعودی میں وہ مشہور حکایت پڑھو کہ :-

" فارغ البال شامیوں کا ایک گروہ علیؑ کے متعلق گفتگو کر رہا تھا، جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں، مگر حقیقتِ حال کا کسی کو پتہ نہ تھا، ان میں ایک بڈھا موجود تھا، لوگوں نے کہا " ابھی یہ تو مجسم تاریخ ہیں انھیں سے پوچھ لیں کہ علی کون تھے"؟ وہ بولے " ہاں ہاں مجھے خبر ہے، اسے فاطمہؑ کا باپ، عائشہ کا بیٹا علیؑ جو کمر کے اونٹ چرا کر مدینہ میں بیچتا تھا، اور رسول اللہ کے ساتھ جنگِ احد میں مارا گیا "۔

اہلبیتؑ کے متعلق شامی پبلک کی معلومات کا یہ حال تھا کہ برسوں کی اموی حکومت نے انھیں اصل واقعات کی خبر ہی نہ ہونے دی تھی، ضرورت تھی کہ اس جہالت کو دُور کیا جائے، جب حسینؑ مکہ سے روانہ ہو رہے تھے تو ابن عباس نے کہا تھا کہ مولا آپ خود قتل ہونے کے لیے جاتے ہیں، لیکن اہلِ حرم کو کس غرض سے اپنے ساتھ لیا ہے، آپ کے بعد ان کا والی وارث کون ہوگا، ہاشمی مدبر کا یہ مشورہ اپنے اندر ایک دُنیائے مطالب پنہاں کیے ہوئے تھا، لیکن حسینؑ کا مطمحِ نظر کچھ اس سے بھی بلند تھا۔

آلِ محمدؐ کا لُٹا ہوا قافلہ جب دمشق اور دیگر بلادِ شام کی بازاروں میں نکلا اور مخلوق اُن کے تماشے کے لیے ٹوٹ پڑی تو خود اُنھوں نے جو یہ کہتے تھے کہ رسول اللہ کا ہمارے سوا کوئی عزیز نہیں فتح کے نشہ میں چور ہو کر یہ بیان کیا کہ

یہ محمدؐ کی بہو بیٹیاں ہیں، یہ علیؑ کی اولاد ہے، وہ حسینؑ کا فرزند ہے:

آؤ! دیکھو خدا نے اُن کو کس طرح ذلیل کیا۔

وہ آلِ محمدؐ کو ذلیل کرنے کے لیے آوازے کستے تھے اور خبر نہ تھی کہ ہم اُن کے حقوق کا اعلان کر رہے ہیں، وہ اُن کو خوار کرنے کے لیے بڑے بڑے شہروں میں تشہیر کرتے تھے اور اُنھیں معلوم نہ تھا کہ ہم اپنے مظالم کے چہرے سے خود نقاب اُلٹ رہے ہیں، عامۃ الناس کے جذبات ہمدردی کو ہیجان میں لانے کے لیے حسینؑ اور اُن کے رفقا کے سر اور رسن بستہ نبی زادیوں کا لُٹا ہوا قافلہ ہی

کچھ کم نہ تھا اُس پر زینبؑ و کلثومؑ کے بامو قع لکچر تو سونے پر سہاگے کا کام کر گئے اور انقلاب پیدا کرنے کا کام جو برسوں میں تکمیل کو نہ پہونچ سکتا تھا وہ مہینوں میں پورا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ دمشق کے ایک دروازے سے اہلبیتؑ کا قافلہ داخل ہوا اور دوسرے سے بغاوت کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

فاطمی تدبر کا یہ وہ زبردست مظاہرہ تھا جس نے غیر معلوم طریقہ پر دُنیا میں اہلبیتؑ کی مظلومی اور بنی اُمیہ کی بیرحمی کا سکہ جما دیا، اور اُن کے خلاف "نفرت و ملامت" کے جراثیم پیدا کر دیے جو آجتک کم و بیش اسلام کے ہر فرقے میں پائے جاتے ہیں، ابن عباس کو کیا خبر تھی کہ امام حسینؑ کے ساتھ ان کے اہل حرم کی موجودگی "اعلان حق" کے لئے ناگزیر تھی، اہلبیتؑ کے مٹانے کی تمام کوششیں ناکام رہیں، وہ بڑھے اور حیرت انگیز طریقہ سے بڑھے، اور ان کے دشمن روز بروز کم ہوتے گئے یہاں تک کہ آج ان کا کہیں پتہ بھی نہیں، اس طرح قرآن مجید کی یہ مشہور پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ	ہم نے تجکو کثیر اولاد عطا کی
الۡکَوۡثَرَ فَصَلِّ	ہے، تو اللہ کی عبادت کیے جا،
لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ اِنَّ شَانِئَکَ	اور اُس کی راہ میں قربانی کر بیشک
ھُوَ الۡاَبۡتَرُ	تیرا دشمن ہی بے اولاد رہ جائیگا۔

امام حسن بصری کا قول ہے:-

• دو آدمیوں نے اسلام کا خانہ خراب کر دیا، ایک عمرو ابن عاص" جنہنے معاویہ کو خلافت دلوائی، دوسرے مغیرہ جس نے معاویہ کو یزید کی جانشینی کا مشورہ دیا۔"

لیکن ہم سے پوچھو تو مغیرہ بیچارے سے زیادہ اسلام کا کوئی ہمدرد نہ تھا، اب تک کفر اسلام کا جامہ پہنے ہوئے آہستہ آہستہ اپنا رنگ جماتا چلا آ رہا تھا، مغیرہ کے مشورے نے وہ لباس اُتار کر پھنکوا دیا اور کفر اپنی تمام عریانیوں کے ساتھ اسلام کے مقابل آکھڑا ہوا، ابتک آلِ محمدؐ پر پوشیدہ طور سے ظلم ہوتے تھے اب یزید نے کھلم کھلا چڑھائی کرنے کی ٹھانی، اور امام حسینؑ نے بھی "اپنی قتل گاہ" کے لیے وہ لق ودق میدان چھانٹا جہاں ایک طرف یزید کی فوج تھی، اور دوسری طرف اپنا مختصر سا گروہ تاکہ پھر قاتل اور مقتول میں کوئی اشتباہ ہی باقی نہ رہے۔

امام حسنؑ کے زہر دینے والوں پر تاریخ پردہ ڈال رہی ہے، امام زین العابدینؑ اور اُن کے سات فرزندوں کے قاتلوں کے متعلق بھی شبہات کی بڑی گنجائش ہے لیکن حسینی شہادت ایسے نمایاں طریقے پر ہوئی کہ دُنیا باوجود کوشش کے اِس میں اشتباہ پیدا نہیں کر سکتی، اگر کربلا کا قتلِ عام "مدینہ و مکہ" میں واقع ہوتا تو دُنیا میں ایک سے زیادہ "مرزا حیرت"[1] پیدا ہوتے اور یزید کی نمک خواری کا

---

[1] دہلی میں ایک بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے محض اپنے اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لیے یہ اعلان کر دیا تھا کہ امام حسین علیہ السلام شہید نہیں ہوئے، یہ افسانہ شیعوں کا گڑھ لیا ہے، اپنے اخبار "کرزن گزٹ" میں دو برس اس مسئلے پر خامہ فرسائی فرماتے رہے، دُنیا جدت پسند ہے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

حق ادا کر کے اس کو قتل کے الزام سے بری کر دیتے۔

حسینؑ پر ضد اور ہٹ دھرمی کا الزام لگایا جاتا ہے، کوتاہ بینوں کا قول ہے کہ یزید کی بیعت بنی ہاشم کو اس تباہی سے بچا لیتی جس نے اسلام کو تیرہ سو برس سے سوگوار بنا رکھا ہے، لیکن یہ لوگ جو فرزندِ رسول سے یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ ایک شراب خوار، زانی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اُنھوں نے در اصل "فلسفۂ اہلبیتؑ" کا مطالعہ ہی نہیں کیا، آلِ محمدؐ کا تو یہ نظریہ تھا کہ سمجھدار انسان نہ خود ساختہ خداؤں کی بندگی کر سکتا ہے نہ نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی، وہ اپنے عمل میں آزاد ہے اور صرف اللہ اور مامور من اللہ کے احکام کی تعمیل کرتا ہے، حسین خود مامور من اللہ تھے، وہ بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے دُنیا میں آئے تھے، یزید کا وجود نہ صرف مذہب بلکہ تہذیب کے لئے بھی خطرہ تھا، حسینؑ کا فرض تھا کہ وہ اس خطرے سے دنیا کو خالی کر دیں، انھوں نے اپنے اس فرض کو حُسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا۔

امام حسینؑ کی روح پر درود وسلام ہو کہ وہ مساوات وحریت کے زبردست حامی تھے، انھوں نے آزادیٔ ضمیر کی خاطر اپنی اور اپنے رفقا کی جانوں کو قربان کر دیا، وہ آخری وقت تک استبداد کا مقابلہ کرتے رہے، انھوں نے اپنی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اور عجائب پرست ہو، ہر نئی چیز کو جسے سنتی ہے اور مزے لے لے کر بے تنقید کرتی ہے، چنانچہ اس عجیب بات کی وجہ سے ان کا اخبار خوب بکا، اور انھوں نے اچھی خاصی دولت پیدا کر لی، مگر انجام بخیر نہ ہوا سے "با آلِ نبی ہر کہ در افتاد بر افتاد"

شہادت کی روح ذرا ملاحظہ کرو، دُنیائے اسلام میں وہ آگ روشن کی جس نے کفر و اسلام کے درمیان ہمیشہ کے لیے فرق کر کے دکھا دیا، وہ خون کے دریا میں کود کر "حیاتِ ابدی" کے مالک ہو گئے، اُن کے حریف کا نام و نشان مٹ گیا، اموی خاندان تباہ ہو گیا، مگر ان کا نامِ نامی آج تک مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔

ان شہیدوں پر خدا کا درود و سلام ہو جو مرتے دم تک صداقت کے راستے پر جمے رہے، نہ تو بھوک اور پیاس نے اُن کے مضبوط ارادوں میں اختلال پیدا کیا، نہ موت کی سختی نے ان کے قدموں کو جنبش دی، انھوں نے بہادری کے ساتھ موت کی سختیوں کا مقابلہ کیا، اور خوشی خوشی اپنی جان اسلام پر فدا کر دی، اُن مقدس عورتوں پر خدا کا سلام ہو جو حسین کی صفِ ماتم پر بچھیں اور قید کی شدتوں کو استقلال کے ساتھ برداشت کرتی رہیں، اے شہدائے کربلا! آپ کی ارواحِ مقدسہ پر ہمارا سلام ہو، آپ اسلام کے سب سے بڑے مجاہدین ہیں، اسلام نے آپ کے خون سے رونق پائی اور آپ کی شہادت بقائے اسلام کا باعث ہوئی۔

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

مہاتما گاندھی کے نام کھلی چٹھی

ہم مہرشی حضرت محمد صلعم اور اُن کے چیلے جگت گرو حضرت علی کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں !

مہاتما جی ! تسلیم !

آپ جیسے مہاپرش، ودیاوان، اور دلیش بھگت کو راہِ ہدایت دکھانا، مذہبی شورہ دینا، منزلِ حقیقت کی نشاں دہی کرنا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے، سحبان و فردوسی کو شاعری سکھانا، طائف کو خم کے گھر لے جانا، آفتاب کو شمع دکھانا، اور آپ کو دہارمک سکشا (مذہبی تعلیم) دینا برابر ہے۔

لیکن آپ کے[1] اخبار "نواجیون" میں یہ خبر پڑھ کر کہ آپ ایک گرو کی

---

[1] ہندوستان کی قومی تحریک کے سلسلے میں گاندھی جی نے بعض ایسی غلطیاں کی تھیں جو اُن کے نزدیک ہمالیہ پہاڑ کے برابر تھیں، ان غلطیوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو ایک شاں گرو کی تلاش تھی، اپنے اخبار 'نواجیون' میں انھوں نے اس خواہش کا اظہار بہت زور شور سے کیا تھا، چنانچہ ہر مذہب کے اہلِ علم نے ان کو خطوط لکھے اور شاں گرو کی نشاں دہی کی، مصنف نے بھی ایک خط لکھا تھا جو یہاں درج ہے۔

تلاش میں ہیں۔ ایک رہنما کے خواہاں ہیں، ایک سالک منزلِ صداقت اور ہادیِ جادۂ حقیقت کو ڈھونڈتے ہیں، میں نے یہ ضروری سمجھا کہ آپ کے سامنے دو ایسی زبردست ہستیوں کو پیش کروں جنھوں نے اپنے زمانے میں دُنیا کی اخلاقی، روحانی اور تمدنی حالت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا تھا، اور جن کے قول و عمل کے نمونے آج بھی مادہ پرست قوموں کی گری ہوئی حالت کو اصلاح پذیر کر سکتے ہیں، ان دونوں بزرگ ہستیوں کے جیون چرتر (حالاتِ زندگی) پر اگر آپ ایک غائر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں ہستیاں دراصل ایک ہی تھیں، جو عالمگیر اور عظیم الشان دعوتِ اخوت کے دو منصبوں پر فائز تھیں، اور اپنے فرائض کو مختلف عنوان سے پورا کر رہی تھیں، ایک گرو تھا دوسرا چیلا۔ ایک اُستاد تھا دوسرا شاگرد، ایک فلاحِ دارین کے قوانین پیش کرنے والا تھا۔ دوسرا اُن کو عملی جامہ پہنا کر دکھانے والا، ایک حکم دینے والا تھا دوسرا اُس کی تعمیل کر کے دُنیا کے لئے نمونے پیش کرنے والا، اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ گرو خود عملی نمونہ پیش نہ کرتا تھا، بے شک وہ خود اپنے چیلوں کے لئے ایک زندہ مثال تھا، مگر اس امر کی زندہ دلیل کہ گرو کے عمل میں کشش ہے، وہ دوسروں کو اپنے نقشِ قدم پر چلانے کی صلاحیت رکھتا ہے، اُسکے بتائے ہوئے اعمال اس قدر سہل ہیں کہ جن پر نہ صرف وہ خود عمل کر سکتا ہے بلکہ اُسکے پاس رہنے والے بھی ان پر عمل کر سکتے ہیں، حضرت علیؓ کی موجودگی

سے ملتی تھی، مسجدِ رسول کے احاطے کے اندر ایک آشرم تھا، جس میں ابوذر غفاری
سلمان فارسی، عمار یاسر، اور مقداد جیسے نامور لوگ رہتے تھے، یہ وہ لوگ تھے
کو سیدھی سادی زندگی بسر کر کے رسول عربی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے
تھے، مجھے معلوم ہے کہ آپ نے رسول کریم کی لائف انگریزی مورخوں کی زبانی
سُنی ہے، مجھے یہ بھی علم ہے کہ ہندوستان کے مشہور و معروف مصنف مولانا شبلی
کی سیرۃ النبی و الفاروق بھی آپ کی نظروں سے گزر چکی ہیں، اگر آپ کے یہ تمام
ذرائع معلومات آپ کے سامنے رسول عربی کو آئیڈیل Ideal گروہ ثابت
کر سکے تو ذرا بھی تعجب کی بات نہیں، در اصل ان مغربی مصنفوں نے حضور
سرورِ عالم کے واقعاتِ زندگی کو پیغمبرانہ روشنی میں مطالعہ کرنے کی کوشش ہی
نہیں کی، انھوں نے ہر جگہ پر عرب دیش کے سیدھے سادھے رشی کو ایک
زبردست گر زمانہ ساز Adventurer قسمت آزما Politician
ہنگامہ جو، امن شکن، تشدد پسند، جاہ طلب انسان ثابت کرنے کی کوشش
کی ہے، خود فاضل شبلی کی کتابیں بھی دبے ہوئے الفاظ میں رسول کی زندگی
کو اسی طرح پیش کرتی ہیں۔ پڑھنے والے کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم
کی زبردست کامیابی کچھ تو موافق حالات کی اور کچھ ان کے تجربکار، ہوشمند،
جہاندیدہ صحابہ کی منت پذیر ہے، میں باوجود اپنی ناقابلیت کے مودبانہ
طور پر آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ نہ تو عیسائیوں کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں

نہ ان مذہب پرست، سرمایہ پسند علما کے پیچھے دار الفاظ پر جائیں جن کے نزدیک رسول کی انتہائی کامیابی وہ ملکی فتوحات ہیں جو اتفاقی طور پر ان کو حاصل ہو گئی تھیں، آپ یقین کیجیے کہ وہ لوگ جو رسول کو صرف ان کے زبردست ملٹری کیریر (فوجی کارناموں) کی وجہ سے قابلِ قدر سمجھتے ہیں سخت غلطی میں مبتلا ہیں، رسول کے مشن کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ حصولِ جاہ و زر کے لیے بنی نوعِ انسان کو جنگوں کی کشمکش میں مبتلا کریں، وہ اشاعتِ مذہب کے لیے تلوار کی مدد کے خواہاں نہ تھے، انھوں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی کسی انسان پر حملہ نہیں کیا، ہاں جب کبھی اسلام کی ہستی خطرے میں پڑ گئی، مخالفین نے مسلمانوں کو صفحۂ عالم سے مٹانے کی ٹھان لی، ملکوں اور شہروں کے امن و امان میں خلل پڑنے لگا تو محض مدافعت کے لیے، قیامِ امن و امان کے لیے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان و مال اور اولاد کے تحفظ کے لیے حضرت نے سعیٔ بلیغ فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اُس جہالت کے زمانے میں تحفظ کا طریقہ سوائے جنگ کے اور کیا ہو سکتا تھا، اگر آجکل کی طرح اُس وقت بھی لیگ آف نیشنز[1]، بین الاقوامی عدالتوں

---

[1] دُنیا تہذیب و تمدن کی دوڑ میں بہت آگے نکل آئی ہے۔ مجلسِ اقوام بھی قائم ہے اور بین الاقوامی عدالت بھی، مگر پھر بھی یہ نظر آ رہا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ ۱۹۳۹ء سے یورپ کی جو حالت ہے، وہ بتا رہی ہے کہ بدنیت دشمن کے جارحانہ حملوں کا جواب نہ دینا خودکشی کرنے کا مترادف ہے۔ دُنیا میں دو قسم کے مذہب ہیں، ایک تو وہ جو سرے سے اہنسا کے قائل ہیں یعنی کسی حالت میں بھی تلوار اُٹھانا جائز نہیں سمجھتے، بدھ مت اور عیسائیت کی یہی تعلیم ہے، دوسرے وہ جو حریف کو زیر کرنے کے لیے ہر وقت تلوار کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔ اسلام ان دونوں کے بین بین ہے، وہ کہتا ہے کہ مذہب کی اشاعت کے لیے تلوار کا استعمال جائز نہیں، لیکن جب دشمن .... (بقیہ صفحۂ آئندہ پر)

اور مجالسِ صلح کا وجود ہوتا، تو رسولِ کریم کو تلوار اٹھانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اگر آپ انسانی فطرت کا مطالعہ کریں اور اس نام نہاد دورِ ترقی کے واقعات کو بنظرِ غائر دیکھیں تو بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ بعض اوقات ضدی اور اجڈ دشمن سے مدافعانہ جنگ کے بغیر چھٹکارہ نہیں ملتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر خدانخواستہ کوئی شخص آپ کے آشرم پر حملہ کرے تو آپ اپنی اور اپنے آشرم والوں کی حفاظت کے لیے رسولِ کریم کے مدافعانہ جنگ سے زیادہ بہتر اور کون سا طریقہ استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ نامور اور شان و شوکت والے بادشاہ جنھوں نے اسلام کا نام لے کر روم و شام، اور چین و ہندوستان کے امن و امان میں خلل ڈالا، جو انسانیت کے لیے ایک خطرہ بن گئے، جو تبلیغِ اسلام کی آڑ میں اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کا

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تم پر حملہ آور ہو اور تلوار کے بغیر حفاظت ممکن نہ ہو تو تلوار نہ چلانا ظلم ہے۔ زبان سے جو جی میں آئے کہیے مگر مدافعت ایسا اصل قانونِ فطرت ہے جس کی مخالفت جاندار تو کیا کائنات کے کسی بے جان ذرے سے بھی ممکن نہیں۔

لہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین میں کوئی زبردستی نہیں)
قرآن کا مشہور و معروف حکم ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی مسلمان تلوار کے زور سے تبلیغِ دین کرنا چاہے تو وہ اپنے نفس کا خود ذمہ دار ہے۔ بات یہ ہے کہ جہانگیری و جہانبانی کا جذبہ ہر قوم میں موجود ہے، مسلمان بھی اس سے مبرا نہ تھے۔ اور صحیح حکومت کے لیے اگر کسی مسلمان بادشاہ نے پیچھا کیا خصوصاً بزدلی کی ہو تو اس سے دینِ اسلام پر کوئی دھبہ نہیں آ سکتا۔ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد وحشی قوموں کی خونخواری اور جنگ و جدل اگر کلیتاً نہیں فنا ہوتی تھی تو اس میں اعتدال ضرور آ جاتا تھا۔ شاید صلیبی جنگ کے سوا شہادت نہ مل سکے کہ غنیم کے ساتھ مسلمان سپاہیوں کا سلوک کتنا شریفانہ ہوتا تھا۔ ہم مسلمان بادشاہوں کی دست درازیوں کی حمایت نہیں کرنا چاہتے مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ اسلام زمین پر فساد پھیلانے کو جائز نہیں کہتا وہ لوٹ مار کا ہرگز حامی نہیں۔ رسولِ اسلام اور ان کے سچے جانشینوں نے کبھی ان افعال کو جائز نہیں کہا، ان کی جنگیں از سر تا پا مدافعانہ ہوتی تھیں اور میدانِ جنگ میں بھی آئینِ اسلام کو ہاتھ سے نہ دیا جاتا تھا۔ مدِ مقابل کو اعلانِ جنگ اور صف آرائی کے بعد بھی جب ہر سپاہی میدان میں آ جاتا تو حملہ کرنے میں سبقت نہ کرتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نہ تو بالکل مذہبِ گوسفندی ہے نہ بالکل مسلکِ جارحانہ، بلکہ انسانوں کا مذہب ہے جو جنگ اور صلح دونوں کو جائز رکھتا ہے، مگر ہر ایک کے لیے شرائط و حدود کو متعین کر دیا ہے۔

شکار کھیلتے رہے جنہوں نے اپنوں اور پرایوں کے خون کی ندیاں بہا کر فاتح عالم و مدبر اکبر کا خطاب حاصل کیا درآصل رسول عربی کی تعلیم کا اصلی مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے ان میں سے ایک مشہور ہستی کے لیئے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ چند سال اور زندہ رہتی تو آج تمام یورپ مسلمان ہوتا، بے شک قرون وسطےٰ میں تلوار کی مدد سے فوجوں کے ذریعے سے کسی بدترین سے بدترین مذہب کی اشاعت کرنا بھی دشوار کام نہ تھا، اور اگر اسلام اپنے ان بادشاہوں پر ناز کرے جنہوں نے تسخیرِ عالم کے کاموں کو خیر و خوبی سے انجام دیا، مغرور سے مغرور بادشاہ کے تخت و تاج کو خاک میں ملا دیا! مضبوط سے مضبوط قلعوں کی بنیادیں ہلا دیں تو اس کا نام دکن کے پنڈاریوں اور روس کے بالشویکوں کی تحریک کے سلسلے میں تو بآسانی لیا جا سکتا ہے، لیکن پھر روحانیت اور امن و امان عالم سے اسے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں رہتا، رسول کی تعلیم کو دیکھنا ہو، ان کے اصلی مفہوم کو سمجھنا ہو تو اس بلند مرتبہ انسان کی لائف پڑھیئے جو ایک زبردست سلطنت کو باوجود اپنے استحقاق کے صرف اس لیئے چھوڑ کر بیٹھ رہا کہ اس کے حصول کے لیئے خون کی ندیاں بہانی پڑتی ہیں، جس نے عرب کے امن و امان کی خاطر بادشاہت پر لات مار کر معلم حکمت و اخلاق کے پیشے کو اختیار کرنا مناسب سمجھا، جب رسول کی تعلیم سے ناواقف لوگ ملکوں کی تسخیر میں مشغول تھے، تلواریں لیئے لیئے دوڑے پھرتے تھے، تیر سے کر مال پر حرص کی

نگاہیں ڈال رہے تھے، تو یہ اپنے شاگرد رشید ابن عباس کو ساتھ لیئے ہوئے علوم و فنون پر لیکچر دینے میں مشغول تھا، قرآن مقدس کی تدوین و ترتیب کر رہا تھا (جسکے چند صفحات آج بھی قسطنطنیہ اور مصر کے اسلامی عجائب خانوں میں موجود ہیں) احادیث رسول کو مجتمع کرنے پر کمر باندھے بیٹھا تھا، قرآن شریف پر تفسیری نوٹ لکھ رہا تھا (جو حکومت وقت نے اپنے سیاسی اغراض کی بنا پر رد کر دیئے) پھر یہ سب اسی بنا پر نہیں کہ وہ تلوار کا دھنی نہ تھا، فنون حرب میں عاجز تھا میدان جنگ سے ڈرتا تھا بلکہ اسکی شجاعت کا لوہا صنادید عرب مانے ہوئے تھے۔ اس کی تلوار کی ایک ضرب عالم کی عبادتوں پر (بقول رسول) فوقیت رکھتی تھی .... وہ مرحب و عنتر اور عمر ابن عبدود کو اسلام کی مدافعانہ جنگوں میں تلوار کے گھاٹ اُتار چکا تھا، ہاںؑ وہ رسول کی تعلیم کے اصلی مفہوم

لہ کسی آئندہ صفحہ پر اس حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے کہ حضرت علی کا نظریہ یہ تھا کہ جزیرہ عرب میں امن و امان قائم کرنے کے بعد اس کو پورے طور پر منظم کر لیا جائے، از بسکہ عربوں کی زندگی فطرت سے قریب تھی اور نام نہاد تمدن اور مہذب قوموں کی خرابیوں سے وہ دور تھے اس لیئے اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کا ان پر جلد اثر ہو سکتا تھا، جب عرب پورے طور پر اسلامی رنگ میں رنگ جاتے تو ان کی مثالی معاشرت سامنے عالم کے لیے نمونہ بن جائے گی، دوسرے لفظوں میں اسلام کو پھیلانے کے لئے حضرت علی کے پیش نظر یہ پروگرام تھا کہ پہلے عربوں کو مکمل مسلمان بنا لیا جائے پھر ان کو دوسری قوموں میں تبلیغ کے لیے بھیجا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا، مسلمان تسخیر ممالک کے زریں شغلے میں پھنس گئے، اسلام کا نقش پختہ نہ ہوا تھا کہ روم و ایران کی قدیم تہذیبوں سے تصادم ہو گیا، اور اس سیلاب میں قوم ایسی بہی کہ پھر دوبارہ اسلام کی حقیقی تعلیم سے دور ہوتی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ عرب رسول کی آمد سے قبل جس حالت میں تھے اسی میں رہ گئے۔ اور دوسرے ملکوں میں اسلام اپنے احوال کے مطابق شکل بدلتا رہا۔ غائر نظر سے دیکھیے ہندی مسلمان بلحاظ اپنے عقائد کے مصری مسلمان سے اور ایرانی مسلمان مراکشی مسلمان سے کس قدر دور ہے، ممکن ہے کہ زبان سے اس کا اقرار نہ کیا جائے لیکن علاوہ ہر ملک کے مسلمان کا عملی اسلام اس کے کتابی اسلام سے علیحدہ ایک چیز ہے ہندوستان میں ہندو تھے، ایران میں دین زردشت تھے اور مصر و شام میں .... (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

کو سمجھتا تھا، اور صرف اسی وجہ سے اس نے ان جنگوں میں حصہ نہ لیا جو سطحی پرست لوگوں نے اپنے ذاتی منافع کے لیے شروع کی تھیں۔

علیؑ کی شخصیت اور رسولِ اسلام کی شخصیت دونوں واقعات کے اعتبار سے بالکل یکساں ہیں، رسول کی مکہ والی زندگی ان کے اخلاق کے اصلی جوہر کو روزِ روشن کی طرح ہویدا کرتی ہے، ان کی مدنی زندگی تو ان کے حلم و عفو کو اور چار چاند لگا دیتی ہے، مکہ ہو خواہ مدینہ صلح کا زمانہ ہو یا جنگ کا رسول کا رویہ ہمیشہ غیر متشددانہ نظر آتا ہے، ہاں یہ ضرور ہے اپنی اور اپنے آشرم والوں کی ہستی کو خطرے سے بچانے کے لیے انھیں ایک سے زیادہ مرتبہ تلوار اٹھانی پڑی لیکن وہ کبھی دفاعی حدود سے آگے نہیں بڑھے اور جب کبھی دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے یا صلح کی درخواست کی تو جنگ روک دی گئی۔

علی کی زندگی بھی بالکل انھیں واقعات کا توارد ہے، رسول کی وفات کے بعد غیر آئینی حکومت سے ان کی ترکِ موالات، خاموش مقابلہ، پھر تختِ خلافت پر متمکن ہو کر ان کی مدافعانہ جنگیں بالکل رسول کی تصویر پیش کر رہی ہیں۔

حضور والا! اگر آپ علیؑ کی اس زندگی پر نظر ڈالیں جو انھوں نے رسول کے بعد بسر کی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ان عربوں کے درمیان

(بقیہ صفحہ گزشتہ) قدیم عیسائی اور یہودی فرقوں نے اس پر کافی اثر ڈالا ہے، بقول برنرڈ شا اسلام تو اچھا مذہب ہے بے شک اس پر عمل کرنے سے عالم کی نجات ہو سکتی ہے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ خود مسلمان بھی اس پر عامل نہیں۔

جو بات بات پر تلوار نکال بیٹھتے تھے، جن کی کدورتیں افراد سے گزر کر خاندانی
قومی اور نوعی حیثیت حاصل کر لیتی تھیں، ایک ایسا انسان موجود تھا جو ستیہ گرہ
اور عدم تشدد کی صحیح طور پر رہنمائی کر رہا تھا، وہ خود اور اُسکے آشرم والے
جو رسُول کی شرفِ صحبت سے فیض یاب ہو چکے تھے اپنی زندگی بھر آئینی طریق
پر اپنے حقوق جتاتے رہے، اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے لیکن انھوں نے
کبھی جارحانہ طریقے استعمال نہیں کیئے، حالانکہ ابوسفیان جیسے نامور سردار نے
انھیں یقین دلایا تھا کہ اگر آپ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جنگ کریں تو
میں مدینے کی گلیاں سواروں اور پیادوں سے بھر دوں، رسول کے بعد علی
کی تلوار زنگ آلود نہ ہو گئی تھی، وہ جوشِ شجاعت جس نے قلعہ خیبر کو ہلا دیا تھا
سرد نہ ہو گیا تھا، مگر اصل بات یہ تھی کہ علیؑ تشدد کے ذریعے اپنے حقوق
حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ اُن مسلمانوں کو جو ایک دن اسلام کی خاطر
اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینے آئے تھے جنگ کی مصیبتوں میں پھنسانے کے خواہاں
نہ تھے، وہ اغیار کو یہ کہنے کا موقع نہ دینا چاہتے تھے کہ جن لوگوں کی مدد سے
حکومتِ اسلام حاصل ہوئی تھی وہی حصولِ حکومت کے بعد تلوار کی نذر کر دیے گئے
اگر چشمِ حقیقت بیں ہو تو یہ امر روزِ روشن کی طرح ہویدا ہو جائے کہ علیؑ نے
خاموش مقابلہ اور آئینی جد و جہد کے ذریعہ بالآخر اپنے مشن کو پھیلا ہی دیا،
اور آج ہزاروں مصیبتوں کا سامنا کر کے سیکڑوں انقلابات سے گزر کر ان کے

مانے والے کم و بیش پانچ کروڑ کی تعداد میں دُنیا کے ہر حصّے میں موجود ہیں۔

حضورِ والا! ترکِ موالات کے عہد میں جس طرح آپ لارڈ ریڈنگ سے تبادلۂ خیالات کرنے گئے اور چند دن ہوئے [1] Sir Henry Lawrence سر ہنری لارنس ایکٹنگ گورنر بمبئی سے جا کر ملے اور زرعی کمیشن کے متعلق انکو مشورے دیئے آپ کو معلوم ہو گا کہ اسی طرح بلا تشبیہ سیدنا علیؑ بھی اپنے زمانے کی حکومت کو مفید مشورے دینے سے کبھی باز نہیں رہے۔ جب کبھی کوئی مشکل درپیش آئی حضرت علی نے حکومت کو ہمیشہ فراخدلی سے مشورہ دیا۔

حضرت محمد صلعم حضرت علی اور اُن کے جانشینوں کو صداقت اور حقیقت کی تبلیغ میں سخت ترین مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ قید خانوں میں ڈالے گئے تلواروں سے شہید کیے گئے، زہر کے ذریعے سے خود ہستی اُٹھانے پر مجبور کیے گئے، لیکن اُنکی ہمت و جرأت ہمیشہ بڑھتی رہی اور انھوں نے اظہارِ حق اور اعلانِ صداقت پر کبھی اپنے آرام کو ترجیح نہ دی۔

کربلا کا دردانگیز واقعہ آلِ محمدؐ اور آلِ علیؑ کے مصائب کا، اُن کے صبر و استقلال کا، اُن کی صداقت و حقانیت کا ایک نہ مٹنے والا نشان ہے، شیطانی حکومت [1] Santanic Gov کے مقابلے میں سیدنا امام حسینؑ نے

---

[1] یہ ظاہر ہو کہ یہ جملے اُس وقت سپردِ قلم کیے گئے تھے جب گاندھی جی تارکِ موالات تھے اور حکومت کے ساتھ عمل کو ناجائز سمجھتے تھے، اب کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے، پُرانا تارکِ موالات آج پکا موالاتی بنا ہوا ہے، اور شیطانی حکومت اُن کے نزدیک رحمانی بنی ہوئی ہے۔

جو زبردست ہمت و جرأت دکھائی وہ دُنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، علیؑ اور اولادِ علیؑ کو بڑے بڑے عہدے پیش کئے گئے، جاگیریں دینے کے وعدے کئے گئے، صرف اس لئے کہ وہ پیغامِ حریت اور اعلانِ صداقت سے باز آئیں، انھوں نے عہدوں کو ٹھکرا دیا، جاگیروں پر لاتیں ماردیں، مگر مشن سے ہاتھ نہ اُٹھایا، مامونؔ[1] رشید نے امام رضاؑ کو ولی عہدی جیسا زبردست عہدہ پیش کیا، مگر آپ نے اُس کو شکریہ کے ساتھ مسترد کر دیا اور جب تک اُس نے

---

[1] ملا محمد مبین فرنگی محلی نے کو اہلسنت کے علماء متاخرین میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے اپنی کتاب وسیلۃ النجات میں اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے۔

"پہلے مامون نے ارادہ کیا تھا کہ خود امر خلافت سے معزول ہو کر یہ منصب حضرت علی رضاؑ کو سپرد کرلے، جب اُس نے اس کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر خلافت آپ کو خدا نے دی ہے تو جائز نہیں ہے کہ آپ کسی دوسرے کو سپرد فرمائیں، اور اپنے آپ کو معزول کریں۔ اور اگر خلافت آپ کا حق نہیں ہے تو آپ کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کو دیں، مامون نے کہا یا ابن رسول اللہ تو میری درخواست قبول ہی کر لیجئے، حضرت نے فرمایا کہ میں اپنی خوشی سے تو ہرگز قبول نہ کرونگا، چنانچہ دو مہینے تک یہی جیص بحث رہی کہ مامون اصرار کرتا تھا اور حضرت انکار فرماتے تھے۔ آخر مامون نے کہا اچھا اگر خلافت قبول نہیں تو ولی عہد ہونا ہی منظور فرمالیجئے، آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے والد ماجد نے اطلاع دی ہے کہ میں تجھ سے پہلے مسموم ہو کر اس جہان فانی کو چھوڑ دونگا، پھر کس طرح یہ عہدہ قبول کروں، بہت رد و قدح کے بعد حضرت نے فرمایا کہ خیر اس شرط پر ولی عہدی قبول کرتا ہوں کہ عزل و نصب کا مجھے اختیار نہ ہوگا میں دور ہی سے بساطِ حکومت پر نظر کرتا رہوں گا۔"

علامہ سید شریف جرجانی شرح مواقف میں فرماتے ہیں

وفی کتاب قبول العہد الذی کتبہ علی بن موسیٰ رضی اللہ عنہما الی المامون انک قد عرفت من حقوقنا مالم یعرفہ اباؤک فقبلت منک ولاٰن الجفر والجامعہ یدلان انہ لا یتم

وہ تحریر جو ولی عہدی کے قبول فرماتے وقت حضرت امام موسیٰ رضا علیہ السلام نے مامون کو لکھ کر دیا یہ تھا:—

"چونکہ تم نے ہمارے ان حقوق کو تسلیم کرلیا جو تمہارے آباؤ اجداد نے قبول نہ کیے تھے، اس لئے میں نے ولی عہدی قبول کرلی مگر جفر و جامعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انجام کو نہ پہونچے گا۔"

قوت وطاقت کا مظاہرہ کر کے، انسانیت اور امن وامان کا واسطہ دے کر خلوص اور نیک نیتی کا یقین دلا کر، آزادیٔ عمل اور حریتِ ضمیر کا فرمان سنا کر، حضرت کو ظاہری اطمینان نہ دلا دیا اُس وقت تک حضرت نے اُس عہدے کو قبول نہ فرمایا اور پھر بھی اپنی حیثیت محض ایک مشیر کی سی رکھی نہ ولی عہد کی سی۔

امام زین العابدین علیہ السلام کو جب مختار نے دعوتِ حکومت دی، تو حضرت نے اُس کو ٹھکرا دیا۔ رضا آل محمدؐ کے داعیوں نے جب صادق علیہ السلام کو تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے لیے بلایا تو حضرت نے یہ کہہ کر ٹال دیا:-

"ہماری سلطنت مادی دُنیا کی نہیں، ہم روحانیت کے بادشاہ ہیں، اسے یہ دُنیاوی سلطنت ہرجائی ہے، آج تیرے پاس ہے کل کسی اور کے پاس چلی جائے گی، ہماری سلطنت لازوال ہے، ہمیشہ سے ہمارے پاس ہے اور ہمیشہ رہے گی"

زید شہید نے کہا اے جعفر صادق:-

"عیش کے بندے بن گئے ہو، خاموشی سے اپنے حقوق کو پامال ہوتے ہوئے دیکھتے ہو اور تلوار لے کر میدان میں نہیں نکلتے"

امام مسکرا دیئے اور فرمایا:-

"جس حقیقت سے میں آشنا ہوں اُس کی تمہیں ہوا تک بھی نہیں لگی"

دُنیا نے دیکھ لیا کہ عدم تشدد کے یہ زبردست حامی بالآخر اپنے مشن میں کامیاب ہوئے

ان کے مخالف باوجود اپنی دولت و حشمت کے پست ہو گئے، مگر آلِ محمدؐ اور ان کے رفیق آج تک عالمگیر شہرت کے مالک بنے بیٹھے ہیں، ان کے مزاروں پر سلاطین کے سر جھکتے ہیں، علماء و فضلا ناصیہ فرسائی کرتے ہیں، ان کے نام تاریخوں کی زینت ہیں، ان کے کارنامے اسلام کی وقعت کو دنیا کی نگاہوں میں زیادہ کر رہے ہیں۔

مہاتما جی! رسولِ اسلام کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ مسلمان سرمایہ دارانہ[1]

۱؎ آئندہ کسی موقع پر یہ تفصیل سے بتایا جائے گا کہ دولت کے متعلق اسلام کا صحیح نظریہ کیا ہے، یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، وہ جانتا ہے کہ انسان کے اندر ملکیت پسندی کی جو جبلت موجود ہے اس کو یکسر فنا نہیں کیا جا سکتا، اس کو یہ بھی علم ہے کہ وراثت اور ماحول کے لحاظ سے انسان کی صلاحیتیں اور قابلیتیں یکساں نہیں ہیں، آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونے اور یکساں ماحول میں پرورش پانے کے باوجود بھی دو آدمیوں میں یکساں صلاحیتوں کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے، اسلام انسانی کی ضروریاتِ زندگی میں بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ تمہاری ضروریات سے جو کچھ بچ رہے وہ اس کی راہ میں صرف کرو (یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو)

سونے چاندی کو جمع کر کے نہ رکھو (والذین یکنزون الذھب
بلکہ خدا کی راہ میں صرف کرتے رہو۔ والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نہ سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہے، نہ جائز طور پر کمانے کمانے اور ذاتی ملکیت رکھنے سے روکتا ہے، بلکہ اس نے جادۂ اعتدال اختیار کیا ہے، انسان جو دولت کمائے اس کو اپنی ملکیت کہہ سکتا ہے مگر خمس و زکوٰۃ و صدقات کے قیود اس پر ایسے عائد ہیں کہ وہ کبھی اس کو کلیتہً اپنے اوپر صرف نہیں کر سکتا، پھر جب معیارِ زندگی سب کا یکساں قرار دے دیا جائے اور ہر شخص اپنی ضروریات کے بعد بچی ہوئی دولت قوم پر صرف کر دے اور سونے اور چاندی کے جمع کر کے رکھنے کا امکان ہی باقی نہ رہے تو سرمایہ دارانہ نظام ظہور ہی میں نہیں آ سکتا، پھر اسلام کا قانونِ وراثت ایسا ہے کہ وہ دولت کو ایک جگہ جمع ہی نہیں ہونے دیتا، اگر اسلام سرے سے انسان کو ذاتی ملکیت سے روک دیتا تو تمدن اور تہذیب کی ترقی رک جاتی اور جد و جہد اور عمل صالح کے لیے ترغیب باقی نہ رہتی، اس نے کہا کہ تمہاری جد و جہد کا ثمر تمہاری ملکیت ہے، مگر چونکہ اس جد و جہد کی قوت خدا نے عطا کی ہے اور ان ثمرات کے حصول کے لیے اعضاء و جوارح اور عقل و تمیز اس نے بخشی ہے اس لیے وہ بھی اس میں تمہارا شریک ہے، اور پھر یہ مادہ جس کی مختلف صورتوں سے دست و گریباں ہو کر تم اپنی دولت کماتے ہو اس کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لیے وہ برابر کا نہیں تو آدھے کا شریک ضرور ہے، اب اس کا جو حصہ ہے وہ تم اس کی مخلوق کے آرام و آسائش کی خاطر صرف کرو، ایک طرف تو... (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

زندگی بسر کریں، وہ دولت کو اپنی قوم میں مساوی طور پر تقسیم کر گئے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ رسول نے مہاجرین و انصار کے درمیان سلسلۂ اخوت قائم کر دیا تھا، مہاجر بھائی اپنے انصاری بھائی کی دولت میں شریک تھا، اور اوائل اسلام میں وراثت میں بھی حصہ لیتا تھا، جو مال ملتا تھا وہ مساوی طور پر تقسیم کر دیا جاتا تھا

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً "تاکہ دولت سرمایہ داروں

بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ کے پاس گھوم پھر کر نہ رہ جائے"

ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہماری جماعت کا کوئی فرد بیجا اقتدار اور ناجائز تفوق کے ذریعے دوسروں کی گردن پر سوار ہو کر حکومت نہ چلائے، وہ روم و ایران کی طرح اپنے بعد تاجداروں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کی بنیاد رکھنا نہ چاہتے تھے، ہاں خدمتِ اسلام کر کے، کارہائے نمایاں بجا لا کر، روحانی تفوق کی سند حاصل کر کے جو شخص سرداری کا استحقاق پیدا کرے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

لیس للانسان الا ما سعی۔ انسان کے لیے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرے۔

اور

کل نفس بما کسبت رھینۃ ہر نفس اپنے عمل کا رہون ہے۔

کہ کو بنی آدم کو باکار بننے کی ترغیب دی، دوسری طرف ان خوش قسمت لوگوں کو جو زیادہ کما سکتے ہیں اپنے غریب بھائیوں کی امداد پر آمادہ کیا، پھر اگر یہ امداد شخصی ہوتی تو ایک بھائی دوسرے کا مرہونِ منت رہتا، زکوٰۃ، صدقات کو ایک مذہبی ٹیکس قرار دیا جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اور وہاں سے تقسیم کیا جاتا ہے، تاکہ دینے والے کا رعب اور لینے والے کی ذلت کا مظاہرہ نہ ہو سکے۔

وہ مسندِ نبی پر بیٹھ سکتا ہے لیکن تاج پوش اور تخت نشیں ہو کر نہیں، بلکہ خادم بن کر، مزدور بن کر، اگر رسولؐ کی یہ دلی خواہش شریعِ اسلام میں عملی جامہ پہن لیتی تو مسلمان ہمیشہ اس مزدورانہ زندگی کے عادی رہتے جس کی نمایاں مثالیں خود رسولِ کریم اور حضرت علیؓ کی زندگیوں میں ملتی ہیں اور جس کی بدولت وہ تھوڑے ہی عرصہ میں دُنیا کی متمدن اقوام پر فوقیت لے گئے، لیکن حکومتِ اسلام کا قرعۂ فال بدقسمتی سے ان لوگوں کے نام پر گرا جو اور حیثیتوں سے تو شاید قابل تھے مگر سرمایہ اور مزدوری کے فرق سے آشنا نہ تھے، بھوکے ننگے عربوں کو جب روم و شام میں دولت کے ڈھیر نظر آئے تو وہ نت نئے جوش و خروش کے ساتھ ملکوں پر جا چڑھے جن کی فتح ہمیشہ کے لیے عیش و عشرت اور سرمایہ پرستی کی بنیاد رکھ گئی، گویا مسلمانوں کے موجودہ انحطاط کے جراثیم اُسی دن اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے، امیرالمومنین علیؓ واقف تھے کہ سرمایہ اخلاق سوز، قاطعِ حریت اور خالقِ استبداد ہے، اسی لیے وہ اپنی زندگی بھر اسکے خلاف وعظ کرتے رہے، یورپ کے نام نہاد لیڈروں کی طرح صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی، یہودیوں کے باغوں میں آب کشی کر کے جو کچھ مزدوری ان کو ملتی تھی وہ بھی فقرا اور مساکین کے نذر ہو جاتی تھی گھر میں ایک کنیز تھی جو اپنی بی بی کے ساتھ مساوات کا درجہ رکھتی تھی، ایک دن بی بی کام کرتی تھی تو دوسرے دن کنیز[1]، ہاں! قنبر غلام کا لباس اپنے آقا سے

---

[1] اسلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ فلسفیوں کی طرح وہ خیالی دنیا میں نہیں رہتا... (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

بہتر ہوتا تھا، بعض کنیز اپنی بی بی سے زیادہ اچھی حالت میں رہتی تھی، علیؑ کے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) بلکہ حقائق سے دوچار ہونے کی کوشش کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے قدیم زمانے کی رسموں کو دفعتہً مٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ یا وہ کلیتہً فنا ہو جائیں یا ان کی خرابیاں دور ہو جائیں۔ اسلام سے پہلے ساری دُنیا میں "بندگی" کا رواج تھا، یعنی کمزور اور پسماندہ قوموں کے افراد طاقت ور اور متمدن قوموں کے "بندے" بنائے جاتے تھے۔ اسلام نے اس سلسلے میں جو سب سے پہلا قدم بڑھایا وہ یہ تھا کہ آئندہ سے کوئی آزاد بندہ نہ بنایا جائے۔ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ اُس کو بندہ بنالے۔ لیکن جو لوگ "بندے" بن چکے تھے اور جن کی تعداد عرب میں ہزاروں تک پہونچی ہوئی تھی ان کو یکدم آزاد قرار دینا دعوتِ بغاوت دینا تھا کیونکہ وہ اصل میں ایک تمدنی اور معاشی سوال تھا۔ ان ہزاروں غلاموں کو دفعتہً آزاد کرنے کے معنی یہ تھے کہ عربوں کو لاکھوں روپے کا نقصان پہونچایا جائے، کیونکہ در اصل یہ ان کی دولت تھی، سرمایہ تھا، راس المال تھا، جس کی خرید و فروخت اسی طرح ہوتی تھی جس طرح دوسری چیزوں کی۔ اگر اسلام ان زرخرید بندوں کی آزادی کا اعلان کرتا تو امریکہ کی طرح وہاں بھی ایک زبردست جنگ چھڑ جاتی اور اُس کے شعلے دور کرنے میں اتنا وقت لگ جاتا کہ رسول عربیؐ کوئی دوسرا کام ہی نہ کر سکتے۔ اس لیے حضرتؐ نے ایک طرف تو بندوں کی بھرتی بند کی دوسری طرف جو "بندے" موجود تھے اُن کا معیارِ زندگی بلند کر کے آقا کی برابری کا درجہ بخشا، یہاں تک کہ بندے (عبد) کے بجائے اُس کا نام بھی غلام ہو گیا جو عربی میں لڑکے کے لیے مستعمل ہے۔ پھر ان غلاموں کی آزادی کو کارِ ثواب قرار دیا گیا، گناہوں کا کفارہ تجویز کیا، ایک مقررہ رقم ادا کرنے کے بعد خود بخود ان کے آزاد ہو جانے کی اسکیم مرتب کی۔ اگر اسلام ساری دُنیا میں پھیل جاتا اور ایرانی اور رومی تمدن پر اسلامی تہذیب غالب آجاتی تو نئے غلام بھرتی نہ ہوتے اور پرانے غلام آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے۔ اس طرح بڑے حسن و خوبی کے ساتھ غلامی کا سدِباب ہو جاتا۔ مگر ہوتا یہ رہا کہ عیسائی اور یہودی غلاموں کو پکڑ کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچتے رہے اور (از بسکہ آدمی اپنے مطلب کے لیے مسائلِ شرعیہ کی تاویل کر لیتا ہے) مسلمان یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ ہمیشہ سے غلام ہیں (اور ہم نے ان کو غلام نہیں بنایا ہے) ان کو خریدتے رہے۔ بہر طور یہ سلسلہ ختم نہ ہو سکا اور اس تاویل کی بدولت، اسلام کی اصل اسپرٹ شکست خوردہ ہو کر رہ گئی۔ جو لوگ قرآن شریف کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ ملک یمین (یعنی بندگی) کا ذکر قرآن میں جہاں آیا ہے وہاں ماضی کا صیغہ بولا گیا ہے:-

ما ملکت ایمانکم — جو تمہاری ملکیت میں آچکے ہیں

حال و مستقبل کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے گویا بنی آدم کی غلامی کو اسلام ایک قصۂ ماضی بنانا چاہتا تھا جو غلام ہو چکے تھے وہ ہو چکے تھے اُن کے بعد کسی آزاد کو غلام بنانے کا حق نہ تھا، لیکن فلسفۂ قتل و خون کے مانع نہ ہونے سے جہاں اور نقصان پہونچے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ غلامی کلیتہً مسدود نہ ہو سکی، اور رفتہ رفتہ مسلمان یہ بھول گئے کہ اسلام دُنیا میں غلامی کا سدِباب کرنے آیا تھا، پھر بھی قیامت تک کوئی قوم مسلمانوں کے اس فخر میں شریک نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے بندگی کو غلامی کا درجہ بخشا اور بچے بچے اپنے زرخریدوں کے ساتھ بیٹوں کی طرح سلوک کیا، کیا ہندوستان کے خاندانِ غلامان کا دورِ حکومت اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ مسلمان اپنے غلاموں کو تختِ حکومت تک بخش دیتے تھے۔ ہماری غلامی روما اور امریکہ کی غلامی کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

گھر میں ایک کھال تھی کہ دن کو اس پہ اونٹ چارہ کھاتا تھا اور رات کو وہ بستر کا کام دیتی تھی، ایک ردا تھی جو فاطمہ کی ستر پوشی کرتی تھی اس میں بھی شتر سے بہتر پیوند تھے، کپڑے کے نہیں لیف خرما کے، اور جب گھر میں کھانے کو نہ ہوتا تھا تو وہی ردا یہودیوں کے وہاں رہن ہونے کو جاتی تھی علیؑ اور ان کی اولاد کا یہ نظریہ تھا کہ جب تک قوم میں ایک شخص بھی بھوکا اور عریاں موجود ہے ہمیں پیٹ بھر کے کھانے اور اچھے کپڑے پہننے کا حق حاصل نہیں، علیؑ کی مزدورانہ زندگی کی گو اس دن قدر کرنے والے موجود نہ تھے اور اہلِ سخاوت کو خرچِ بیجا اور ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے تھے لیکن آج دنیا علیؑ کے طرزِ عمل کی قدر شناسی کرنے کو تیار ہے، تیرہ سو برس پہلے علیؑ نے جو سبق پڑھایا تھا وہی آج لینن، کارل مارکس اور سٹالن ابھی پڑھا رہے ہیں، شاید آپ یہ خیال کریں کہ تنگ دستی نے علیؑ کو سادہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، نہیں نہیں وہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر بھی اتنے ہی سادے رہے۔

حضرتؑ کے عہدِ خلافت میں ایک شخص رات کے وقت آپ سے ملنے آیا، وہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہم اگر اقوامِ غیر سے غلاموں کو خریدتے بھی تھے تو مساوات کا درجہ عطا کرنے کے لیے، آدابِ انسانیت سکھانے کے لیے، ایک عدل پرور سوسائٹی کی رکنیت بخشنے کے لیے، کیونکہ ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارے ماحول میں رہ کر ان غلاموں کی عقل و فکر، اور اخلاق و آداب کا معیار بڑھ جائے گا، اور یہ اور ان کی آئندہ نسل صحیح معنوں میں متمدن اور مہذب بن سکے گی، تاریخ کا مطالعہ بتائے گا کہ ہمارا یہ عقیدہ غلط نہ تھا۔

کہتا ہے کہ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، اندھیری رات تھی، میں جو کوفہ کے دارالامارہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کوئی آدمی ایک پتلی سی چادر میں لپٹا ہوا کھڑا ہے، اور سردی سے کانپ رہا ہے، غور سے دیکھا تو وہی حیدرِ کرار مولا علیؑ ابن ابی طالب تھے، عرض کیا یا امیر المومنینؑ کیا حال ہے؟ فرمایا "مدینہ سے یہی ایک چادر لے کر چلا تھا، خدا کی قسم تمہارے بیت المال سے میں نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں لیا۔"

جب پہلے پہل یہ دین و دُنیا کا بادشاہ مسجدِ کوفہ میں خطبہ پڑھنے کے لیے داخل ہوا، تو مجمع نے آگے بڑھنے کی جگہ نہ دی، کیونکہ تن میں ایک کرتا تھا جس میں جا بجا لیفِ خرما کے پیوند لگے ہوئے تھے، سر پہ ایک عمامہ تھا وہ بھی بابا آدم کے زمانے کا، یہ تھا لباس جس کو زیبِ تن کر کے علیؑ اپنا پہلا شاہی خطبہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے، کسی نے دریافت کیا یا علیؑ آخر اس قدر سادگی میں کیا راز ہے؟ فرمایا "رئیس اس کو دیکھ کر سادگی اختیار کریں اور غریبوں کی تسلی ہو کہ ان کا بادشاہ بھی انھیں جیسا ہے۔"

مہاتما جی! میں نے مختصر الفاظ میں ان دونوں بزرگ ہستیوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا ہے جن کو میں آپ کے لیے اور تمام دنیا کے لیے آئیڈیل [illegible] گرد سمجھتا ہوں، اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ ان دو حضرات کے واقعاتِ زندگی

اور تعلیم و فلسفہ کا اپنے طور پر مطالعہ فرمائیں، علیؑ اور ان کے جانشین مصیبتیں اُٹھاکر
قیدیں کاٹ کر، اپنے خون میں نہاکر، اسلام کی اشاعت کرتے رہے، حالانکہ
نہ اُس کے بدلے میں انھیں مال و دولت ملتا تھا نہ سلطنت ملنے کی اُمید تھی
بلکہ لوگوں سے رہی سہی صاحب سلامت بھی جاتی تھی، اگر آپ آلِ محمدؐ کے
فلسفہ پر غور فرمائیں گے تو انشاء اللہ آپ کے اوپر بڑے بڑے حقائق اور معارف
روشن ہوجائیں گے، آلِ محمدؐ کے ہر قدم پر آپ کو عدمِ تشدد Passive
Resistance خاموش مقابلے، مزدورانہ زندگی اور نفرت بہ سرمایہ کے
ہزار ہزار باب کھلے ہوئے ملیں گے، آپ اُن کو اپنی ہی طرح کھدر میں ملبوس،
خدمتِ قوم میں مشغول، اور سادی غذا کھانے والا پائیں گے، یہ سب اسلئے
نہیں کہ وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، دین و دُنیا میں فرق
کرتے تھے، تمدن کو مذہب سے جُدا جانتے تھے، بلکہ اس لیے کہ اُس وقت
ملک کی اقتصادی حالت اسی کی مقتضی تھی، ہاں جب امام محمد باقرؑ کے
عہد میں مزدوروں کی حالت کچھ سنبھل گئی اور طبقۂ ادنیٰ کے مسلمان بھی پیٹ بھر کر
روٹی کھانے لگے تو امام کے لباس اور غذا میں بھی فرق نظر آنے لگا، امام
جعفر صادقؑ کے زمانے میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا، حضرتؑ نے اپنے سکریٹری
سے پوچھا کہ ہمارے یہاں کس قدر غلہ ہے، اُس نے عرض کی کہ "سال بھر کے لیے
کافی ہے" حضرتؑ نے فرمایا وہ سب غلہ نکال کر فقرا کو تقسیم کردو، اور پھر روزانہ

دوسروں کی طرح بازار سے خرید لایا کرتا کہ ہم پر سرمایہ داری کا الزام نہ رہے۔

آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ عالمگیر امن وامان کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں، اگر آپ مزدور طبقے کے معیار کو بلند کرنے کے خواہاں ہیں، اگر آپ غلام قوموں کو بغیر تشدد کے آزاد کرنے والی پالیسی پر کاربند ہونا چاہتے ہیں تو خدا کے لیئے علیؑ اور اولادِ علیؑ کے فلسفہ کا مطالعہ کیجیے، اور تاریخ کی روشنی میں دیکھیے کہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے تخت کس طرح خاموش مقابلہ کے ذریعے اُلٹ دیئے گئے، ظالموں اور فتنہ پردازوں کو بغیر تلوار کے کس طرح ذلیل کر دیا گیا، اور باوجود قیدوں اور پھانسیوں کے آزادیٔ ضمیر اور حریتِ عمل کو کس طرح قائم رکھا گیا۔

میں اپنا فرض ادا کر چکا، نئی تحقیق کے لیئے ایک میدان آپ کے سامنے پیش کر دیا، جس گروہ کی آپ کو تلاش تھی اُس کا فوٹو آپ کے سامنے موجود ہے غور سے دیکھیے، خط و خال پر نظر دوڑائیے، بالکل آپ کے دل کی سی تصویر ہے۔

ملتِ گریہ کُن سے دُو دُو باتیں

سال بھر کے مرے ہوئے کو رونا "معیوب سمجھا جاتا ہے" اور ہم شیعوں کی یہ حالت ہے کہ تیرہ سو (۱۳۰۰) برس کے مُردوں پر (نہیں نہیں شہیدوں پر) آنسو بہا رہے ہیں" ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے، یزید بھی چل بسا، سیّدنا امام حسین علیہ السلام بھی خلد نشین ہو گئے نہ مصائب رہے، نہ مصائب اُٹھانے والے، نہ ظلم رہا نہ ظالم" نہ کربلا کے بقیۃُ السیف ہیں، جن سے اظہارِ ہمدردی کریں، نہ بنی اُمیہ موجود ہیں جن کو تاثیرِ قلب کھائیں، پھر یہ آہ و زاری کیسی، یہ غل و شور کس لئے، یوں تو بارہ مہینے شیعہ اشک فشاں رہتے ہیں، مگر محرم آنے نہیں پاتا کہ قیامت برپا ہو جاتی ہے، آلِ محمدؐ کے مصائب پر آنسو بہانا اور اُن کے دشمنوں سے اظہارِ نفرت کرنا انھوں نے اپنا قومی شعار بنا لیا ہے۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ حسینؑ کے ذکر میں تاثیر ہے، وہ مجروح دلوں کا مرہم ہے، افسردہ قوموں کے اندر روحِ حیات پھونکنے والا ہے، حسینؑ کا رونا ایثار اور قربانی کا سبق دیتے ہیں، صبر و استقلال، ہمت و جرأت کی ترغیب دلاتے ہیں، ظلم سے نفرت اور صداقت سے محبت کی عادت ڈالتے ہیں۔

گزشتہ زمانے میں شیعوں کو اپنی منتشر قوتوں کو جمع کرنے اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح قائم رکھنے میں ان مجلسوں کی وجہ سے بہت مدد ملی ہے .... ہم کمزور دل والی عورتوں کی طرح مُردہ حسینؑ کی لاش پر سر و سینہ نہیں پیٹتے، ہم ناکامی اور حرماں نصیبی سے گھبرا کر اپنے دشمنوں پر نفرین نہیں کرتے .... ہمارا رونا ہمارا ماتم مسلمانوں کی اُس بےحسی اور ناعاقبت اندیشی پر ہے جس نے انھیں دنیا کے زبردست ریفارمر کے قتل پر آمادہ کیا، آہ! صرف قتل ہی پر نہیں اُس کی ہر ممکن توہین پر، اُسکے خاندان کی تباہی پر، اُسکے گھر بار کی تاراجی پر،

ہماری نفرت شخصیتوں سے نہیں ہے، بلکہ ظلم و ستم سے ہے، کفر و طغیان سے ہے، جاہ پرستی و عشرت طلبی سے ہے، سرمایہ داری اور بیجا تفوق سے ہے، اور ہر اُس صفت سے ہے جو بنی نوع انسان کے لیے مضر، اور سوسائٹی (جماعت) کے لیے خطرناک ہو، ظلم خواہ دوست پر ہو یا دشمن پر بہر حال ظلم ہی ہے اور اُس کی درد بھری داستان سن کر ہمدردی کے دو آنسو بہانا

خلاف انسانیت ہے، اگر ہم ایک طرف یزید اور شمر کے مظالم پر نفرین کرتے ہیں تو دوسری طرف مختار اور اُن کے رفقائے کار کی اُن غلطیوں (یا کم از کم لغزشوں) کو بھی جو جوشِ انتقام میں اُن سے سرزد ہوئیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے، ہمارے معصومین علیہم السلام نے کبھی مختار کے تمام کاموں کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھا، اور حد ہوگئی کہ آج تک ہمارے بعض علماء کو اُن کی نجات میں شک ہے، ظلم خواہ اہلبیتؑ پر کیا جائے یا اہلبیتؑ کے دشمنوں پر ہمارے نزدیک قابلِ ملامت ہے، عزت و جاہ کی خواہش، بیجا تفوق کی آرزو، سرمایہ داری کی تمنا، دوست کی طرف سے ہو یا دشمن کی طرف سے ہم اُسے یکساں سمجھتے ہیں، یعنی ہمیں شخصیتوں سے نفرت ہے نہ محبت، ہم اعمال کی بنا پر نفرت اور محبت کرتے ہیں، اسلام جو تمام بنی نوع انسان کو مساوات کا سبق پڑھانے آیا تھا، جو بادشاہ اور فقیر، سرمایہ دار اور مزدور کے امتیازات کو دور کرنا چاہتا تھا، ہرگز اس تنگ نظری کا مرتکب نہیں ہوسکتا کہ ایک کافر کو اُسکے اعمال پر سزا دے، اس پر ابدی لعنت کا

۱؎ یہ ایک عجیب بحث ہے، تولا اور تبرا مذہب امامیہ کا جزو رہے، گر عام مسلمان اس سے چڑھتے ہیں، غور سے دیکھو تو تولا اور تبرا دونوں فطری چیزیں ہیں، کائنات کی ہر چیز کچھ چیزوں کی طرف رغبت رکھتی ہے اور کچھ چیزوں سے نفرت کرتی ہے، چھوٹے چھوٹے ذروں سے لے کر بڑے بڑے اجرام سماوی تک سب اسی قاعدے میں جکڑے ہوئے ہیں، مذہب امامیہ ہم کو برائی سے نفرت اور بھلائی سے اُلفت کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اور جیسا کہ متن کتاب میں بیان کیا گیا ہے "کسی انسان سے محبت یا نفرت اُسکے اعمال کی بنا پر ہوسکتی ہے" بس تولا اور تبرا کا یہی مفہوم ہے، یہ ظاہر ہے کہ انسان تقلید اور نقل کرنے والا حیوان ہے، یہ اپنے ہمجنسوں کی مثال سے جلد متاثر ہو جاتا ہے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ووٹ پاس کر دے، اُس سے ترکِ موالات اور قطعِ تعلقات کرنے کا حکم دے اور نام نہاد مسلمانوں کو باوجود اُن کے سخت ترین مظالم کے لعنت کی پھٹکار سے محروم رکھے۔ اس لیئے اگر ابوجہل اور ابولہب پر لعنت ہے، شیطان پر لعنت ہے تو اُن مسلمانوں[لہ] پر بھی ہے جنھوں نے ابوجہل اور ابولہب کی سُنت کا احیا کیا اور دُنیا میں آسمانی سلطنت کے بجائے شیطانی حکومت قائم کر کے خدا کے پاک بندوں کا خون بہایا، بنی اسرائیل بھی بظاہر ایماندار لوگ تھے مگر ان پر حضرت داؤد اور عیسیٰ کا لعنت کرنا قرآن سے ثابت ہے، غلطیاں ہر انسان سے ہوتی ہیں اور معمولی معمولی فروگزاشتوں پر باز پرس کرنا انسان سے ملکوتی صفات کی تمنا کرنا ہو، لیکن وہ لوگ جو جان بوجھ کر غلطیاں کریں جن کی غلطیوں کا اثر اپنی ذات سے گزر کر ملک و ملت تک پہونچنے لگے، جو نظامِ عالم میں خرابی ڈالنا چاہیں، جو کسی مستحکم مذہب کے اصول بگاڑ دیں، جو دین و ایمان میں رخنہ اندازیاں کریں، جو سفاکی اور خونریزی میں درندوں سے بھی دو قدم آگے رہیں، اُن کو رحمتِ حق کا اُمیدوار سمجھنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

پھر جس سے اُس کو محبت و اُلفت ہو اُس کے رنگ میں وہ بہت جلد رنگ جاتا ہے، آلِ محمد کی تعلیم ہے کہ بُروں سے محبت نہ رکھو، ایسا نہ ہو کہ تم بھی بُرے ہو جاؤ، اچھوں سے محبت کرو تاکہ تمہارے اعمال بھی ان ہی کی طرح اچھے ہو جائیں، سب و شتم اور گالیاں بکنا اس مذہب کا جزو نہیں ہے، یہ ایک غلط فہمی ہے جو خدا جانے کس نے پھیلا دی ہے۔

لہ یہ ایک معقول بات ہے کہ ظالم سے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان اظہارِ بیزاری کیا جائے، ظلم خواہ وہ کسی کے ہاتھ سے ہو بہر حال ظلم ہے۔

لعنت نہ سب وشتم ہے نہ گالی، قرآن جیسی مہذب کتاب میں اس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے...... یہ تو (VOTE OF CENSURE.) قرار دادِ ملامت کا عربی ترجمہ ہے، ہر مہذب قوم اپنے بدترین افراد پر ملامت کا ووٹ پاس کرتی ہے، کل ہی کی بات ہے کہ ہندو اور مسلمانوں نے جنرل ڈائر اور سر مائیکل اڈوائر کے خلاف ایسا ہی ووٹ پاس کیا تھا، وہ لوگ جو شمر[1] اور یزید اور ان ہی جیسے دوسرے لوگوں کو اُمیدوارِ رحمت سمجھتے ہیں انھوں نے دراصل رحمت کے معنی غلط سمجھ رکھے ہیں، بنی نوع انسان کے دشمن کو نسلِ آدم کے خراب کرنے والے کو، خاندانِ اہلبیت کے مٹانے والے کو، عفو کر کے خدا اپنی شانِ رحمت اور عدالت تو نہیں دکھا سکتا، ہاں چنگیز خانی ادا دکھائے تو دکھائے جس کے یہاں ظلم بھی بھرپور تھا اور بخشش بھی پوری پوری تھی گو دونوں بے محل اور بے وقت ہوں۔

حسینؑ کو قتل کر کے یزید نے صرف اللہ ہی کا گناہ نہیں کیا بلکہ اُس کے سیکڑوں بندوں کے دل بھی دُکھائے، نظامِ دین میں خرابی بھی ڈالی، اسلام کو ذلیل بھی کیا، اور دُنیا کے مستقبل کو...... ایک بڑی حد تک

---

[1] ظالم کو رحمتِ حق کا اُمیدوار سمجھنا سچ مچ دُنیا میں ظلم وستم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، ضرورت ہے کہ ظلم وستم کے خلاف رائے عامہ کو استوار کیا جائے، تاکہ بنی آدم امن و امان کی چند سانسیں لے سکے۔

جس جرم کے خلاف سوسائٹی اظہار نفرت نہیں کرتی، اُس کا استیصال وعظ و پند اور نصائح کی مدد سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔

تیرہ و تاریک کر دیا، اگر کربلا کا ہولناک دن دُنیا میں نمودار نہ ہوتا تو آج عالم کی تاریخ کچھ اور ہوتی، خدا اُن گناہوں کو معاف کر سکتا ہے جن کا اثر ضرر کرنے والے کی ذات تک محدود رہے، لیکن وہ خطائیں جن کے نتائج دوسروں کو بھی بھگتنا پڑیں "حقوقِ عباد" کی حد میں آجاتی ہیں، اور حقوقِ عباد کو معاف کرنا عادل اور انصاف پرور خدا کا کام نہیں ہے، اگر یزید اور اُس کے حوارئینِ شام کا رندے جنّت میں جائیں گے تو جنّت جنّت نہ رہیگی بلکہ انڈمن[1] کا جزیرہ بن جائے گی جہاں مجرم رہتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ زبردست گناہوں کو معاف کرنا مجرموں کو جرأت دلانا اور جرائم کی تعداد بڑھانا ہے، جب ایسے مجرموں کا مقام بھی جنّت ہی رہا تو ہم وہاں سے نکل آئیں گے کیونکہ ہمارے سردار علیؑ کا قول ہے:۔

"جب کمینے کسی فرش پر بیٹھ جاتے ہیں تو ہم وہاں سے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔"

خدا کی قسم آلِ محمدؐ کی محبت میں دوزخ میں جلنا ہمارے لیے اُس بہشت سے بہتر ہے جو آلِ محمدؐ کے قاتلوں کو اُن کے مظالم کی پاداش میں ملے۔

---

[1] وہ جزیرے جن میں ہندوستان کے جرائم پیشہ لوگوں کو جلا وطن کیا جاتا ہو خلیج بنگال میں واقع ہیں، اور جزائر انڈمن کے نام سے مشہور ہیں، اصل باشندوں کے علاوہ جو سیاہ فام وحشی ہیں وہاں جو بھی آباد ہے وہ یا جرائم پیشہ ہے یا قدیم جرائم پیشہ لوگوں کی اولاد ہے۔

ایک دفعہ پھر اس نظریہ پر غور کر لیجیے کہ ہم مصائب کربلا پر صرف اس لیئے نہیں روتے کہ وہ حسینؑ اور ان کی اولاد پر پڑے تھے، بلکہ ہم مصائب کی اہمیت پر آنسو بہاتے ہیں، جفاؤں اور ستموں کی شدت پر اشک فشاں ہیں، یہ ظلم حسینؑ پر ہوں یا کسی دوسرے پر ہم کو اظہار ہمدردی تقضائے انسانیت معلوم ہوتا ہے۔

وہ دل جو درد بھری داستان سن کر بھر نہ آئے شیشہ کا ایک ٹکڑا ہے، وہ آنکھ جو مصیبت کے مناظر دیکھ کر ڈبڈبا نہ جائے روزنِ دیوار ہے، انسان اور حیوان کے درمیان ہمدردی ہی حدِ فاصل بناتی ہے، وہ لوگ جو فلسفۂ حیات سے واقف ہیں جنھوں نے علم النفس (سائیکالوجی) کا مطالعہ کیا ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ خلوص کا بہترین مظاہرہ آنکھوں ہی کے ذریعے سے پیش کیا جاتا ہو، انتہائی خوشی بھی آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہو، اور انتہائی رنج کا اظہار بھی آنکھیں ہی کرتی ہیں۔

آنسو خوشی اور رنج دونوں کا مظاہرہ ہیں، مگر آنکھوں کی متضاد کیفیتیں ان دونوں حالتوں میں فرق بیان کرتی ہیں، رونے کے بعد قلب کی صفائی بڑھتی ہے اور وہ بہترین جذبات کا مسکن بن جاتا ہے، یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ رونے کے بعد انسان اُس وقت تک جب تک دیگر لوازمات انسانی اُس روحانی کیفیت کے اثر کو زائل نہ کر دیں گناہ کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا

یہ لمبا چوڑا بیان اُس الزام کے جواب میں ہے جو اس مضمون کی تمہید میں درج کیا گیا ہے، مگر میرا دل تسلیم ہی نہیں کرتا کہ حسینؑ کے ذکر میں تاثیر ہے

ان کے کارنامے کسی مُردہ قوم میں جان ڈال سکتے ہیں، بے ہمتوں کو ہمت اور بے صبروں کو صبر کا سبق دے سکتے ہیں، آج سیکڑوں برس سے شیعہ حسینؑ کے عزم و استقلال، ہمت و جرأت، ایثار و قربانی شوقِ شہادت اور ذوقِ جہاد کی داستانیں سُنتے چلے آرہے ہیں، لیکن کیا ان کی قومیت کے تنِ بے جاں میں رُوح پیدا ہوئی؟ کیا اُنھوں نے حسینی کارناموں سے کوئی سبق حاصل کیا؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو میرا قلم یہیں رُکا جاتا ہے، اور اگر کچھ منچلے شیعہ اس کا جواب اثبات میں دینے کے لیے تیار ہیں تو میں اُن سے یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ آج سُنّتِ[1] حسینی کو زندہ کرنے کا وقت ہے، جزیرۃ العرب ایک یزیدِ ثانی کے زیرِ حکومت ھل من ناصر ینصرنا کے نعرے بلند کر رہا ہے، جیرانِ حرم رسول سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، آلِ محمدؐ کے

---

[1] مصنف کے خیال میں حسینی شہادت کی یادگار تازہ رکھنے کا منشا یہ ہو کہ ہم کو ظلم سے نفرت اور عمل صالح کی طرف رغبت پیدا ہوتی رہے۔ شجاعت، صبر اور استقلال کے جذبات ہمارے قلب میں پیدا ہوں اور مناسب محل و موقع کے استعمار میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے رہیں، جیسے ہی کوئی امتحان کی گھڑی یا مصیبت کا وقت آئے وہ جذبات عمل جامہ پہن لیں۔ جنت البقیع کے روح فرسا واقعات پر فدایانِ آلِ محمدؐ کی بے حسی کا عالم دیکھ کر مصنف کا دل بے چین ہو گیا تھا اور اُس نے اپنی قوم کو یہ طعنہ دیا تھا کہ تم نے سیرتِ حسینؑ سے کیا یہی سبق حاصل کیا ہے؟

۱۹۳۲ء میں جب قوم نے ۳۱ مارچ کے ہوائے عالم گیرنگ کے خلاف ہیجانی احتجاج کیا اور ہزاروں افراد جیل گئے، اور بیسیوں جانیں بھی تسلیم ہوئے، تو مصنف نے محسوس کیا کہ قوم سیرۃِ حسینؑ پر گامزن ہونا جانتی ہے، اب تک جو خوابِ غفلت طاری رہا تو وہ قائدین کی سہل انگاری اور نااہلیت کی وجہ سے تھا۔

سر بفلک مقبرے سربسجود پڑے ہیں، یثرب و بطحا تباہ ہو چکے، طائف میں بنی ذ طمہؓ کا خون پانی کی طرح بہہ چکا، اٹھو اور دنیا کو دکھا دو کہ تیرہ سو برس کی مجلسوں نے تم کو کیا فائدہ پہونچایا ہے .... حسینی شہادت کی روایتوں نے تمہارے خون میں کون سی حرارت پیدا کر دی ہے، تمہارے احساسات کو کس قدر لطیف بنا دیا ہے، اگر حجاز کی سب سے بیش بہا چیزیں کھونے کے بعد بھی تم کو ہوش نہ آیا تو میں صاف کہہ دوں گا کہ تم نے حسینؓ کے خون کو ضائع کر دیا، تم نے اُس شہید راہ خدا کے مشن کو برباد کر دیا، تم حلوے مانڈے کھاتے رہے، قورموں اور شیرمالوں پر ہاتھ صاف کرتے رہے، مگر حسینؓ کے کارناموں سے تم نے خاک بھی سبق حاصل نہیں کیا، میں نے شیعوں کو مجلس کے حصوں پر لڑتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے تعزیوں کی معمولی سی توہین پر اُن کے بھبکے ہوئے شیر کی طرح جھپٹنے کا ہولناک منظر بھی معائنہ کیا ہے، اور میرا دل آج ثواب کے اصلی حصوں کی تقسیم پر اور اصلی مزاروں کی توہین پر اُن کے جوش کو دیکھنا چاہتا ہے، اُٹھو! اور ماتمی رضاکاروں کے گروہ بناکر افغانستان اور ایران میں اپنے درد دل کی داستانیں سناؤ، اور وہاں کے تاجداروں کو خدا سے ڈرا کر اپنا ہم خیال بناؤ، اور پھر اُن کی فوجوں کی معیت میں حجاز اور اہل حجاز کو مصیبتوں سے بچاؤ، ہر امیر اپنے اور اپنے چند ساتھیوں کے اخراجات کا بندوبست کرے، اگر خود نہ جا سکے تو

رضاکاروں کی مالی امداد کرے، اور اپنے حلقۂ اثر میں رضاکاروں کی بھرتی کے لیے کوشش کرے، غرض امیر اپنے مالوں کو اور غریب اپنی جانوں کو اسلام کے قدموں میں ڈال دیں، اور اس طرح امام حسینؑ علیہ السلام کی سنت کا احیا کریں، عورتیں اپنے مردوں کو غیرت دلاکر زوجۂ حبیب بن مظاہر کی پیروی کریں، اور مائیں اپنے بچوں کو خدمت قوم کے لیے پیش کرکے زینبؑ اُمّ لیلیٰ اور اُمّ فروہ وغیرہ کی مثال قائم کریں۔ بیرون بھٹورہ میں جب انجمن خدام الحرمین کا جلسہ ہوا تھا تو اس میں ایک حنفی عالم مولوی حسین علی شاہ صاحب نے بیان فرمایا تھا کہ میرے سامنے چند حاجیوں نے بحلف یہ شہادت دی کہ ہم نے خاتونِ جنت کے مزار سے رونے کی آواز آتے ہوئے سنی۔

اے شیعو! کیا تم اپنے پیغمبر کی پیاری دختر اور اپنے اماموں کی والدۂ ماجدہ کی اس بے بسی کی آہ و زاری کو دیر تک گوارا کروگے، یہ صحیح ہے کہ فاطمہ کا خدا بے بس نہیں، وہ ظالم کو جلد سزا دے سکتا ہے، لیکن وہ تمہاری غیرت کا امتحان لے رہا ہے، وہ تمہارے جوشِ ایمانی کو آزماتا ہے، وہ تمہارے یٰلَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا والے دعووں کی صداقت کو دیکھتا ہے۔ مختار سچا مسلمان تھا جس کا خون کربلا کے واقعہ کو سُن کر جوش کھا گیا، کیا اس چودھویں صدی میں کوئی "مختار" پیدا نہیں ہوسکتا؟ سنتا ہوں کہ اکتوبر میں شیعہ کانفرنس کا اسپیشل اجلاس امروہہ میں منعقد ہوگا اور اس میں معاملات شیعہ کا بیچ

کے ساتھ ساتھ حادثاتِ حجاز پر بھی بحث کی جائے گی۔

اب شیعوں کے اہل الرائے اصحاب کا یہ فرض ہے کہ وہ وہاں مجتمع ہو کر کوئی راہِ عمل نکالیں، میرے خیال میں فنڈ اکٹھا کرنے اور والنٹیر تیار کر کے کسی اسلامی سلطنت کو دینے سے بہتر اور کوئی سبیل نہیں ہے، وزیر اعظم ایران نے جو زبردست بیان معاملاتِ حجاز پر دیا ہے وہ ہمیں امید دلاتا ہے کہ بالآخر یہی[1] اسلامی سلطنت اس طرف پیش قدمی کرے گی۔

سلہ یہ منصوبے خواب و خیال سے زیادہ وقیع نہ نکلے، اور اب تک کہ ۱۹۳۶ء ہے جنت البقیع کی تعمیر کا کوئی سامان پیدا نہ ہو سکا۔ حجاز ایک دور دراز ملک ہے، اور فی الحال کوئی امکان اس کا نہیں کہ کوئی مؤثر اقدام وہاں کی حکومت کے خلاف کیا جا سکے، جس سے مجبور ہو کر وہ عالم اسلام کے مطالبات کو منظور کر لے، وہابی قبائل کا وہ جوش و خروش کم ہو گیا ہے اور تطہیر حجاز اور تجدید دین کے جذبے سے ولولے ان کے دلوں میں باقی نہیں ہیں۔ قبے تو مسمار ہو ہی چکے تھے سنا ہے کہ قبروں کے نشان انھوں نے بنا دیے ہیں جس سے زائر کو یہ پتہ لگ سکتا ہو کہ فلاں بزرگ کی قبر ہے۔ یہ اصلاح ایرانی حکومت کی کوشش سے ظہور میں آئی ہے۔

مسلمانوں کا لاڈلا خلیفہ

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے واقعات کا اعادہ کرتی رہتی ہے اور دُنیا کے تھیٹر میں آئے دن پُرانے تماشے نئے پردوں کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں، لیکن آج سے تیرہ سو برس پہلے حق و باطل نور و ظلمت، کفر و اسلام، استبداد اور حریت، سرمایہ داری اور مزدوری کی یادگار جنگ کا جو ڈرامہ کربلا کے میدان میں دکھایا گیا تھا اُسکی نظیر نہ تاریخ کے اوراق پر ملتی ہے اور نہ تماشا گاہِ عالم کے اسٹیج پر، حسینؑ کی دردبھری داستان کربلا میں آلِ محمد کی تباہی کا قیامت خیز منظر، رسولِ اسلام کی وصیتوں کی کھُلم کھُلا توہین، کمزور انسان کی اُس قلبی کیفیت کی ایک زبردست مثال ہے جو خودغرضی، حرصِ دُنیا اور مطلب پرستی کے دیوتا کی پرستش سے پیدا ہوتی ہے، تیس بتیس سال کا وہ ضدی نوجوان، جس کو زمانے نے امیرالمومنین بنا دیا تھا، جو

رسولِ اسلام کا جانشین اور خلیفہ کہلاتا تھا، جسکے منہ سے نکلی ہوئی بات قانونِ شریعت تھی، جس کے حرکات و سکنات سنتِ رسول سمجھے جاتے تھے، دراصل اُس سیاسی اجتماع کی صدائے بازگشت تھا جو آلِ محمدؐ کے جائز حقوق پر فاتحہ پڑھنے کے لیے بعد رسول منعقد کیا گیا تھا۔

ابوسفیان کے سیاسی[1] فرزند زیاد کا لاڈلا بیٹا عبیداللہ انسان نہ تھا، اُسکے دل سے وہ تمام جذبات فنا ہو چکے تھے جو حیوانِ ناطق اور حیوانِ مطلق کے

---

[1] زیاد تاریخ اسلام کی عجیب و غریب ہستی ہے۔ امیر معاویہ کے عہد تک لوگ اُس کو زیاد بن ابیہ یعنی "اپنے باپ کا بیٹا زیاد" کہتے تھے کیونکہ اس کے باپ کا نام کسی کو معلوم نہ تھا حضرت علیؑ کے عہدِ خلافت میں ان کا طرفدار تھا اور عراق کے شیعوں سے خوب واقف تھا، جب امیر معاویہ بادشاہ ہوئے تو اُنھوں نے اس کی خدمات سے فائدہ اُٹھانا چاہا، اور وہ چار جھوٹی سچی شہادتیں پیش کرا کر اُس کو ابوسفیان کا بیٹا ثابت کرا دیا اور بنی اُمیہ کے خاندان کا ایک فرد بن کر اُس نے آلِ محمدؐ اور شیعیانِ آلِ محمدؐ پر جو ظلم کیے وہ تاریخ اسلام کے پڑھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں، عبیداللہ ابن زیاد جو امام حسین علیہ السلام کے واقعہ شہادت کے وقت کوفہ کا گورنر تھا اسی رسوائے عالم باپ کا رسوائے عالم بیٹا تھا، یہاں "سیاسی فرزند" کا مطلب یہی ہے کہ معاویہ نے اس کو سیاسی اغراض کے لیے اپنے باپ کا بیٹا بنا لیا تھا۔ مورخ ابوالفدا نے اس واقعہ کو کس قدر عریانی کے ساتھ نقل کیا ہے:-

واستلحق معاوية زياد بن سمية جارية الحارث بن كلدة الثقفي فزوجها لعبيد له رومي يقال له عبيد فولدت سمية زيادا على فراشه	معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو اپنے نسب میں داخل کر کے اپنا بھائی بنا لیا تھا سمیہ مذکورہ حارث بن کلدہ ثقفی کی کنیز تھی، حارث نے اُس کی شادی اپنے رومی غلام عبید سے کر دی تھی زیاد کی ولادت اسی کے گھر میں ہوئی

وكان ابو سفيان قد سار في الجاهلية الى الطائف فنزل على انسان يبيع الخمر يقال له	ابوسفیان ایام جاہلیت میں طائف گئے تو ابو مریم نام ایک شراب فروش کے یہاں اُترے (شراب کے جام پر جام پینے کے بعد جب نشہ چڑھا) تو ابو مریم

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

درمیان حدِ فاصل بناتے ہیں، وہ انسانی لباس میں ایک درندہ تھا، اور شاید اس سے بھی بدتر، برخلاف اس کے فاطمہؑ کا فرزند، رسولِ اسلام کا نواسہ اُن تمام فضائل کا مجموعہ تھا جو انسان کے لیئے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں، اُس کا قلب سرچشمۂ ہمدردی تھا، اُس کا ہر قدم بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کی طرف بڑھ رہا تھا، اُس کی کتابِ حیات کا ایک ایک ورق کمالِ انسانیت کی ایک تفسیر تھی، ٹھیک اُس وقت جب دُنیائے اسلام سرمایہ کے نشہ میں سرشار تھی، جب تیرے میرے مال پر مسلمان دانت لگائے بیٹھے تھے، جب ملکوں کی مہذب لوٹ مار نے بھوکے عربوں کے دماغوں کو بگاڑ دیا تھا، جب ظلم اپنے آپ کو پورے طور پر عریاں کر چکا تھا، جب استبداد جو سرمایہ داری کا پہلا نتیجہ ہے اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ منظرِ عام پر آچکا تھا، مزدور باپ کا مزدور بیٹا مساوات اور آزادی کا بھولا ہوا سبق پڑھانے کے لیے اُٹھا، اور صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل کے ذریعہ سے اُس نے اس حقیقت کو عُریاں کر دیا کہ ظالم اور جابر حکومت کے زیرِ سایہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ابوسفیان قد اشتہیت النساء فقال ابو مریم هل لك في سمية فقال ابوسفيان هاتها على طول ثديها وذفر بطنها فوقع عليها فقال انها علقت منه بزياد

نے کہا کوئی عورت بھی لاؤ، ابو مریم نے جواب دیا کہیے تو ...... سمیہ کو بلا دوں ابوسفیان نے کہا خیر وہی سہی ...... غرض یوں زیاد کا حمل قرار پایا۔

اپنے دورِ حکومت میں معاویہ نے ایک مجلس منعقد کی اور بہت سے لوگوں کی شہادت سے کر زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا، زیاد نے اپنے بیٹے کا نام عبیداللہ اپنے باپ عبید کی مناسبت سے رکھا تھا۔

ذلت کی زندگی بسر کرنا، مظلوموں کی آہ وزاری سن کر خاموشی اختیار کرنا، سر اٹھانے کے بڑھتے ہوئے خطروں کو دیکھنا اور ان کے خلاف آواز نہ اٹھانا، آلِ رسول کے شعار کے منافی ہے، وہ اپنے ذاتی مصائب پر صبر کر سکتے تھے، وہ اس مذہبی تنگ نظری کو برداشت کر سکتے تھے، جس نے ان کے شیعوں کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا، لیکن ان سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ قوانینِ اسلام کی کھلم کھلا توہین کی جائے اور ایک ننگِ انسانیت جزیرۃ العرب کے ہر شریف باشندے پر عرصۂ حیات تنگ کردے اور وہ دیکھتے رہیں، یزید جیسے بداطوار، شرابخوار اور خود پرست بادشاہ کا وجود سیاسی حیثیت سے بھی اسلامی سلطنت کے لیے ایک خطرہ تھا، وہ ایک اموی دل رکھتا تھا، بیرحمی اور سنگدلی میں اس نے اپنے آباؤ اجداد کی پوری پیروی کی، لیکن قدرت نے اس کو اموی دماغ نہیں دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ امورِ سلطنت میں وہ ہر جگہ ٹھوکر کھاتا تھا، دیکھو اس کے دورِ حکومت میں جابجا بغاوتیں شروع ہو گئیں، اور سلطنت کے نئے نئے دعویدار پیدا ہونے لگے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے جانشین مولوی ثناء اللہ امرتسری یزید کے تدبر، حسن سیاست اور معاملہ فہمی کی جتنی چاہیں تعریف کریں، لیکن تاریخ تو اس کی سیاسی غلطیوں کو عالم آشکارا کر چکی ہے، بیشک وہ کسی بزم نشاط کی زینت کا باعث ہو سکتا تھا، بیرحم شکاریوں کا کوئی گروہ اس پر ناز کر سکتا تھا،

اُس کے وجود سے کسی میکدے کی رونق بڑھ سکتی تھی، دکن کے پنڈاریوں، ممالکِ متوسط کے بیرحم ٹھگوں اور وسط ایشیا اور روس کے ظالم انار کسٹوں کی کوئی ٹولی اُس کو سرمایۂ افتخار سمجھ سکتی تھی، مگر اسلام جو امن و امان کا دعویدار ہے، ظلم و جور کے مٹانے کا مُدّعی ہے، مساواتِ عامّہ کا حامی ہے، اپنے بنیادی اصول کو مٹائے بغیر اس کی حمایت میں آواز بلند نہیں کر سکتا تھا، یہ مسلمانوں کی بد قسمتی تھی کہ استخلاف، غلبے اور اجماع کے ذریعے جو خلیفہ اُن کی گردن پر سوار کیا گیا (یزید) وہ نہ صرف عرب بلکہ خود اموی خاندان کی تباہی کا باعث بن گیا، یزید اور اُسکے خون آشام نیم وحشی ایجنٹ حسین کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے کہ قوت اور طاقت کا مظاہرہ روحانیت اور صداقت پر غلبہ حاصل کر رہا ہے، لیکن تلوار کی ہر وہ ضرب جو آلِ محمدؐ اور اُن کے ساتھیوں پر پڑتی تھی در اصل خاندانِ بنی اُمیّہ کے تابوت کی ایک کیل بنتی جاتی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ حسینؓ کے عدمِ تدبر کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے پیروں سے موت کی طرف چلے آ رہے تھے، ان کی نظریں مستقبل کے پردے میں اس تباہی کو دیکھ رہی تھیں، کوفہ والوں کی بے وفائی مشہورِ عالم تھی، مگر وہ تھے کہ کوفیوں کی طرف بڑھ رہے تھے، انھوں نے لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کو نظر انداز کر دیا، وہ دیدہ و دانستہ آتشِ حسبر

میں کود پڑے، اور اس طرح نہ صرف اپنی جان کو ضایع کیا بلکہ تمام بنی ہاشم کے گھر میں ماتم کی صفیں بچھا گئے، مدینہ حرم نبی تھا، مکہ دارالامن تھا، ان دونوں کو چھوڑ کر عراق کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ (وہ عراق جس نے .... ان کے باپ کو دھوکا دیا، جس نے اُن کے بڑے بھائی کے ساتھ دغا کی)۔

آؤ تاریخی واقعات کی روشنی میں حسینؑ کے طرزِ عمل پر ایک سرسری نظر ڈالیں، امام حسنؑ اور معاویہ کے صلحنامہ کے بعد عرب میں اچھا خاصہ امن ہو گیا تھا، گو معاویہ اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہے، انھوں نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ سیکڑوں مرتبہ صلحنامہ کے شرائط کی توہین کی، امیرالمومنین علیؑ پر بلاناغہ لعنت ہوتی تھی، عراق کے شیعہ پوشیدہ سازشوں کے شکار بنائے جاتے تھے، ان کے وظیفے ضبط ہو گئے تھے، اُن کی جاگیریں چھین لی گئیں تھیں .... یہ سب کچھ تھا مگر آلِ محمدؐ کی طرف سے صلحنامہ کے شرائط کا پورا پورا احترام کیا گیا، گو معاویہ کی وفات کے بعد سلطنت صلحنامہ کے شرائط کے مطابق حسینؑ کو ملتی تھی، لیکن حسینؑ نے کبھی سلطنت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، وہ اپنے نانا رسولِ عربی کی قبر کے مجاور تھے اور ٹوٹے ہوئے بوریئے پر بیٹھ کر عبادت کرنا تختِ خلافت سے بہتر جانتے تھے اگر یزید کو سیاست سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا تو وہ اپنے ہوشیار اور جہاندیدہ باپ

معاویہ کے اُس آخری مشورے پر ضرور عمل کرتا جسکے الفاظ یہ تھے :-

" اے میرے پیارے یزید ! میں نے تیری خاطر زمین و آسمان کو ایک کر دیا ہے ، عرب کے بڑے بڑے سرکشوں کو تیری بیعت پر آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا ، لیکن شکر ہے کہ سب مشکلات حل ہو گئیں ، اب دو تین آدمی رہ گئے ہیں ، ایک عبداللہ ابن عمر ، دوسرے عبداللہ ابن زبیر تیسرے حسینؑ ابن علیؑ ، عبداللہ ابن عمر ایک سست آدمی ہے ، وہ خوشامد کا بندہ ہے ، زبیر کا فرزند چالاک اور فتنہ جو ہے اسکے شر سے غافل نہ رہنا ، رہے حسینؑ ، آہ وہ رسولؐ کے فرزند ہیں ، فاطمہؑ کی یادگار ہیں ، اُن سے مزاحمت نہ کرنا ، لیکن بستر مرگ پر علیل تیرے باپ کو تکلیف دے رہا ہے کہ تو اس آخری وصیت پر شاید عمل نہ کرے گا ، اے یزید ! حسینؑ اپنی جان دے دے گا مگر تیرے ہاتھ پر بیعت نہ کرے گا ، آہ حسینؑ کی موت اموی خاندان کے خاتمہ کا پیش خیمہ ہو گی "

انجام بین معاویہ کے یہ الفاظ عرب کی اُس وقت کی پوری پالیٹکس (سیاست) کا ایک خلاصہ تھے ، اگر یزید اس مشورے پر عمل کرتا تو آج اسلام کی تاریخ اتنی دردناک نہ ہوتی ، ناتجربہ کار ، عیش پرست اور نوعمر خلیفہ نے سب سے پہلے جو فرمان صادر کیا وہ دُنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔

یزید آج کل کے فیشن پرست نوجوانوں کی طرح شاید اپنے باپ کو بیوقوف سمجھتا تھا، اُس کا خیال تھا کہ مرض نے اُسکے حواس مختل کر دیئے ہیں، کبر سنی نے اُسکے حوصلوں، ولولوں اور جوش وخروش کو سرد کر دیا ہے اور میں تو اب عملی دُنیا میں داخل ہو رہا ہوں، یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میرے حکم سے سرتابی کرے اور موت کے گھاٹ نہ اُتار دیا جائے، میری سلطنت میں رہے، میرے امن وامان سے فائدہ اُٹھائے اور بیعت نہ کرے!

آہ! جس بات کا معاویہ کو خوف تھا وہ ظاہر ہو کر رہی، یزید نے حسینؑ کے قتل کا فرمان صادر کر دیا، رسولؐ کا مدینہ حسینؑ کے لیے دارالامن نہ رہا، ان کی جان خطرے میں پڑ گئی "لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" کو مدنظر رکھتے ہوئے حسینؑ نے مدینہ کو خیرباد کہہ دیا، وہ رات جس کی صبح کو تاجدارِ مدینہ کا فرزند مکہ کی طرف چلا ہے قیامت کی رات تھی، حسینؑ رسولؐ کے مزار سے لپٹے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے:۔

• اے دین و دُنیا کے بادشاہ! آپ کا امن پسند نواسہ آج وطن سے نکالا جاتا ہے، اُس کو قتل کی دھمکی دی جا رہی ہے۔

سلطانِ مدینہ! آپ کو خبر ہے کہ میں دُنیا وی سلطنت کا خواہاں نہیں میں آپکے مزار پہ رہ کر دین و مذہب کی خدمت کرنا ہی بادشاہت

سلہ مقتل ابو مخنف

سمجھتا ہوں، اے نانا! آپ کی پیاری دختر کا چھوٹا فرزند آج مصیبت میں گرفتار ہے، گرمی کے دن ہیں، راہ میں پانی کی قلت ہے، ننھے ننھے بچوں کا ساتھ ہے، یا رسُول اللہ! میں کہاں نکل جاؤں، کس جگہ جا چھپوں؟ آہ! اس بھرے کنبہ کو کس کے حوالے کروں، میرے بعد ان کی حفاظت کرنے والا کون ہے؟ نانا جان! اب دُنیا رہنے کے لائق نہیں رہی، آپ کی اُمت نے بابا جان کے ساتھ کیا کیا، بھائی حسنؑ پر کیا کیا ظلم کیے، آہ! آپ کے ہرے بھرے گھر کی نشانی ایک میں رہ گیا ہوں، خدا کے لیے مجھے بھی جی اپنی لحد میں لے لیجئے کہ قیامت تک آرام کی میٹھی نیند سوتا رہوں۔"

رات کا وقت تھا، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، حسینؑ پر نیند کا غلبہ ہوا، خواب میں اپنے پیارے نانا کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں:-

"اے بیٹے حسینؑ! اے میری مظلوم دختر کی نشانی! تیرے مصائب نے میں تو میں اولین و آخرین سب کو رُلا دیا ہو، بیٹا صبر کر، اللہ اُمت کی خاطر صحرا نوردی بھی کرنی پڑے تو خوشی خوشی اختیار کر، پیارے! تیری مصیبتیں قیامِ اسلام کا باعث ہوں گی۔" (آخری سلام)

حسینؑ خواب سے چونکے تو دیکھا قبرِ رسول ہے، رات کا سناٹا ہے، اور تنہائی کا عالم ہے، ایک مرتبہ پھر اپنے نانا کی قبر پر حسرت بھری نگاہ ڈالی،

اور جنت البقیع کے قبرستان کی طرف قدم اٹھایا، اپنی دکھیاری ماں کی قبر پر آئے اور باآواز بلند فرمایا:۔

"اے تاجدار مدینہ کی دختر، اے مظلوم ماں! اپنے فرزند کا آخری سلام لیجئے، کون جانتا ہے کہ پھر آپ کی قبر پر آنا ہوگا یا نہیں .... اماں جس فرزند کو آپ نے چکی پیس پیس کر پالا تھا، جس کی ذرا سی تکلیف سے آپ پریشان ہو جاتی تھیں، آج وہ سخت گرمی کے موسم میں گھر سے نکالا جاتا ہے، اماں! اپنے پیارے فرزند کو رخصت فرمائیے، وہ تنہا عازم سفر نہیں ہے، آپ کی زینبؑ اور امّ کلثومؑ بھی اسکے ساتھ ہیں، اماں! کل آپ کا گھر سنسان ہو جائے گا، مدینہ کی رونق جاتی رہے گی، آہ! اب آپ کی قبر پر روزانہ فاتحہ پڑھنے کون آئے گا، تمنا تھی کہ موت آئے تو آپکے پہلو میں آکر آرام کروں، آہ! اب وادئ غربت میں قبر بنے گی۔"

حسرت و یاس سے ماں کی قبر پر ایک آخری نگاہ ڈالی، پھر امام حسنؑ کے مزار پر آئے اور فرمایا:۔

"اے مظلوم اور مسموم بھائی! بھائی کی جدائی کا وقت آن پہنچا، ہم اپنی قبر کی طرف جانے کو تیار ہو گئے، یہ مدینہ آپ کو

مبارک ہو، ہم کسی جنگل میں ڈیرہ ڈالیں گے، بھائی! یزید نے آپکے صلحنامہ کی خاک قدر نہ کی، وہ سلطنت تو کیا واپس دیتا، ہماری جان کے درپے ہو گیا۔"

جنت البقیع سے لوٹ کر حسینؓ گھر آئے اور سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ یہ نہ خیال کرنا کہ فاتح خیبر کا فرزند بزدل تھا، موت سے ڈرتا تھا، مصائب کے برداشت کرنے سے گھبراتا تھا، نہیں، وہ اپنے زور کو بتا رہا تھا کہ اب مدینہ میرے لیے دارالامن نہیں رہا، یزید قتل کا فرمان میرے لیے جاری کر چکا ہے، اگر میں مدینہ میں رہونگا تو ضرور قتل کر دیا جاؤنگا، اور حرم رسولؐ کی حرمت برباد ہو گی، حسینؓ نے اعلیٰ درجہ کے تدبر سے کام لیا اور خطرے کے مقام کو خالی کرنے کی ٹھان لی۔

۳ر شعبان کو حسینؓ مدینہ سے چلے، اور منزلیں طے کرتے ہوئے چند روز بعد مکہ میں داخل ہوئے، مکہ وہ مقام تھا جہاں مچھر تک مارنے کا حکم نہیں (وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا)۔ حسینؓ نے چاروں طرف نظر ڈالی، لیکن مکہ سے بہتر امن کا مقام خیال میں نہ آیا، اس لیے وہ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔

دیکھو! حسینؓ نے خطرے سے بچنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، وہ حتی المقدور اپنے آپ کو بچاتے ہی رہے، لیکن حالات

مختلف تھے، زمانے کو کچھ اور منظور تھا، مکہ بھی حسینؑ کے لیے دارالامن نہ رہا، یزید نے سیکڑوں شامیوں کو حاجیوں کے لباس میں حسینؑ کے قتل پر مامور کر کے مکہ کی طرف روانہ کر دیا، اب اگر حسینؑ مکہ میں رہتے تو ضرور خونریزی ہوتی اس لیے حج سے ایک دن پہلے حسینؑ مکہ سے چل کھڑے ہوئے۔

آہ جب تمام دنیائے اسلام کے باشندے مکہ میں جمع ہو رہے تھے جب ان کے نانا کے مقرر کردہ حج کا زمانہ قریب آرہا تھا حسینؑ مکہ کو خیرباد کہہ رہے تھے[1] قیامِ مکہ کے زمانے میں کوفہ والوں نے ایک دو نہیں[2]

---

[1] ابن جریر طبری نے فرزدق سے روایت کی ہے کہ میں نے امام حسین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ حج سے پہلے مکہ کو کیوں خیرباد کہہ رہے ہیں، فرمایا اے فرزدق اگر میں جانے میں عجلت نہ کروں تو دشمن مجھے گرفتار کر لیں گے، اسی مورخ کے بیان کے مطابق حضرت نے عبداللہ ابن زبیر سے کہا "واللہ اگر میں ایک بالشت مکہ سے باہر قتل کیا جاؤں تو مجھے یہ امر بہ نسبت اس بات کے گوارا ہے کہ ایک بالشت مکہ کے اندر قتل کیا جاؤں، بخدا اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں چھپ جاؤں تب بھی لوگ مجھے وہاں سے نکال کر قتل کر دیں گے"

[2] نورالعین فی مشہدالحسینؑ مولفہ علامہ ابو اسحاق اسفرائنی میں یہ حالات مفصل طور پر درج ہیں، آخری خط کا مضمون یہ ہے:-

یاحسین یاابن بنت رسول الله ان یزید بن معاویة ظالم وجار وقتل الرجال ونهب الاموال وطغی وتمرد ...... وانا قد ارسلنا الیك یااباعبدالله سابقاً نحوالف کتاب نطلبك ان تحضر عندنا حتی نساعدك علی الیزید ...... فنسئلك بحق جدك المصطفی صلی الله علیه وآله وسلم ان تحضر عندنا ان لم تحضر فغداً بین یدی الله نحاصمك

آپ کو معلوم ہے کہ یزید نے ہم پر ظلم و جور برپا کر رکھا ہے، قتل و غارت اور طغیان و تمرد پر کمر باندھی ہے، ہم لوگوں نے آپ کی خدمت میں تقریباً ایک ہزار خطوط ارسال کیے (جن میں تحریر تھا کہ) آپ آئیے ہم یزید کے مقابلے میں آپ کی مدد کریں گے، اب ہم آپ کو آپ کے جد محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی قسم دیتے ہیں کہ ضرور تشریف لائیے، اگر آپ تشریف نہ لائے تو کل پیشِ خدا ہم آپ سے جھگڑا کریں گے اور کہیں گے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بلکہ سیکڑوں خط حسینؓ کے نام بھیجے اور اُن کو کوفہ آنے کی دعوت دی لیکن حسینؓ اُن کے حالات سے واقف تھے اُن کی عادتوں کو جانتے تھے، انھوں نے ان خطوں کی طرف مطلق اعتنا نہ کی، آخری خط میں کوفہ والوں نے لکھا تھا:-

"اے حسینؓ! اگر آنا ہو تو آئیے ورنہ قیامت کے روز ہم آپ کے نانا سے کہہ دینگے کہ ہم نے امامِ وقت کو دعوت دی، ہم ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار تھے لیکن وہ جان بچا کر بیٹھے رہے، انھوں نے فرضِ امامت کی ادائیگی میں کوتاہی کی، وہ اعلائے کلمۂ حق سے باز رہے:"

بے شک بحیثیت امام کے حسینؓ کا یہ فرض تھا کہ وہ کوفہ والوں کی دعوت پر لبیک کہیں اور ان کو اپنے فیوض سے مستفید ہونے کا موقع دیں، جب اٹھارہ ہزار آدمی بیعت کے لیے تیار تھے تو بظاہر کوفہ خطرے سے خالی تھا، اگر حسینؓ نے یہاں بھی تدبر سے کام لیا اور اپنے جانے سے قبل اپنے بھائی مسلمؓ ابن عقیل کو تحقیقِ حال کے لیے روانہ فرمایا، اور

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) ونقول یا ربنا ظلمنا الحسین ودعی فینا بالظلم والجور فی القتلہ فماذا تقول وما جوابہ الذی تقول بہ اللہ

[illegible]

کہ خداوندا حسینؓ نے ہم پر ظلم کیا اور ہمیں مبتلائے ظلم و ستم دیکھنا گوارا فرمایا، معلوم نہیں آپ کے عقوق امت کا کیا جواب دیں گے؟

کہہ دیا کہ تم وہاں جا کر لکھو کہ کوفہ کی طرف آنا مناسب ہے یا نہیں۔

ایک طرف تو یزیدی حجاج مکہ میں داخل ہو چکے تھے، دوسری طرف مسلم ابن عقیل جیسے خیر خواہ نے لکھ بھیجا تھا کہ کوفہ والے پورے طور پر آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں، آپ بے خوف و خطر ادھر چلے آئیے، اب مکہ سے نکلنے اور کوفہ کی طرف رُخ کرنے کے لیے ظاہری واقعات کی بنا پر حسینؑ کے پاس کون سا عذر رہ گیا تھا، اس لیے حسینؑ نے کوفہ کا رُخ کیا، راستے میں پہلے تو مسلم ابن عقیل کی شہادت کی خبر ملی پھر آگے چل کر حُر کے لشکر سے دُو دُو باتیں ہوئیں، جس سے ثابت ہو گیا کہ کوفہ بھی دارالامن نہیں ہے، اب حسینؑ نے ایک دوسری طرف چلنے کا ارادہ کیا اور قسمت کشاں کشاں اُس زمین پہ لے آئی جہاں کی خاک میں ملنے کی حضور کو مدت سے آرزو تھی۔

اب صاحبانِ عقل غور کر کے بتائیں کہ حسینؑ خود موت کی طرف بھیجے یا موت نے حسینؑ کا پیچھا کیا ۔

نہ پایا چین یثرب میں، نہ کعبہ میں ملی راحت

جدھر جاتے تھے حضرت موت دامنگیر پھرتی تھی

ہم مانتے ہیں کہ کربلا کی جنگ ظاہری واقعات کی بنا پر آلِ محمدؐ کی زبردست شکست تھی، یزیدی فوج فتح و ظفر کے نقارے بجا رہی تھی، کوفہ اور شام میں بازار آراستہ ہو رہے تھے، لیکن اس فتح میں بھی ابھی

زوال کے جراثیم پوشیدہ تھے، آلِ محمدؐ کی تشہیر گو ظاہری اعتبار سے ان کی ذلت ہو لیکن باطن میں اُس نے زبردست کام کیا، آلِ محمدؐ کے صبرو استقلال اور بنی اُمیہ کے ظلم و ستم کی داستانیں عالم آشکارا ہو گئیں اور جلد ہی رعایا کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا، جس نے رفتہ رفتہ بنی اُمیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ یزید اور اُس کے خاندان والے سب مٹ گئے، آج اُن کی قبروں کا بھی نشان نہیں ملتا۔ لیکن آلِ محمدؐ کا عروج ہوتا گیا؛ وہ آج بھی کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں اُن کا دربار سلاطین کی جبین نیاز کے لیے باعث فخر ہے، اُن کے مقبرے رحمتِ الٰہی کا مسکن بنے ہوئے ہیں۔

آہ! چودھویں صدی کے یزید ابن سعود سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آلِ محمدؐ تو سر بفلک مقبروں میں محوِ خواب ہوں اور اولادِ معاویہ کا پتہ بھی نہ لگے۔ اس لیے وہ اپنے وحشی لشکروں کی مدد سے ان عجائباتِ عالیات کو مٹا کر خاک کر دینے کی فکر میں ہے، لیکن اے ہندوستان کے دہا بیو! تم ابن سعود کو میرا پیغام پہونچا دو کہ :-

"نجد کے زمیندار! تجھ سے قبل بڑے بڑے جاہ و جلال والے بادشاہ گزر گئے، شاید تم نے یزید کا نام سُنا ہو، متوکل عباسی کے حالات تاریخ میں پڑھے ہوں، ان کے دل میں بھی یہ آرزو تھی کہ آلِ محمدؐ

کا نام و نشان مٹا دیں، لیکن افسوس کہ وہ یہ آرزو اپنے دل ہی میں لے گئے، متوکل نے ایک قبرِ حسینؑ کے مٹانے کی کوشش کی تھی ہم نے آج لاکھوں قبریں بنا دیں ۔۔۔۔۔۔۔ غور سے دیکھ دنیا میں قبرِ حسینؑ کی کتنی شبیہیں موجود ہیں، تو بھی جنت البقیع کو مٹا کر دیکھ لے، ہم اسکی بھی ایک دو نہیں ہزاروں نقلیں بنا سکتے ہیں، تو اینٹ اور گارے کے مقبرے گرا رہا ہے، تجھے یہ خبر نہیں کہ مسلمانوں کے کروڑوں دلوں کے اندر فاطمہؑ کے مقبرے بنے ہوئے ہیں،

تیرا یہ خیال کہ دنیا میں سُنی اور شیعہ تو بہت ہیں مگر مسلمانوں کا پتہ نہیں، کسی حد تک صداقت پر مبنی ہے، بے شک اگر آج ایک بھی سچا مسلمان ہوتا تو تجھ کو اتنی بڑی جرأت نہ ہوتی، آج مسلمان اخوتِ اسلامی کے رشتے توڑ توڑ کر یورپ کے سرمایہ داروں کی طرح وطن پرست اور قوم پرست بن گئے ہیں، ان کی ہمدردیاں اپنے ملک کی حدود تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں، وہ اسلام کے نام پر جان دینے سے جی چراتے ہیں، وہ فتووں اور مسئلوں کی آڑ لیئے بیٹھے ہیں، ان کے پیشِ نظر امکان اور عدمِ امکان کے سوالات ہیں، لیکن کربلا کے شہید کے پاس ان باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں تھا، وہ اپنے ستر ۷۰ دو بہتر ۷۲ جانبازوں کو لے کر جن میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی تھے، میدان میں کود پڑا، اور

اپنے خون میں نہاکر اسلام کی عزت کو بچالیا۔

اے ابن سعود! تو آزادی سے اپنا شن پورا کر کہ نہ تو ایران سے کوئی آدمی آئے گا، نہ ہندوستان والے تیرا کچھ کر سکیں گے، ایران والے پچھدار فارسی میں چند تار بھیجدیں گے اور ہندوستان والے لمبے لمبے رزدلیوشن پاس کرتے رہینگے، ترکی تو پہلے ہی تیری سنت پر عامل ہے، رہا افغانستان وہ نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں، وہاں کے اخبارات مدتوں تک تجاہل عارفانہ کر کے واقعات کی صداقت ہی سے انکار کرتے رہیں گے، ہاں اتنا یاد رکھ کہ وہ خدا جس نے فرعون کو آناً فاناً میں فنا کر دیا، جس نے نمرود کے غرور کو توڑ دیا، جس نے ابرہہ کو خاک میں ملا دیا۔ آج بھی دنیا اور ما فیہا پر حکومت کرتا ہے، اس کی لاٹھی میں آواز نہیں، وہ ظالم کو مہلت ضرور دیتا ہے، لیکن اُس کا انتقام غضب کا انتقام ہے۔ ارے روس کی طرف نگاہ اُٹھا، زار کی تباہی سے عبرت حاصل کر، تو دنیا کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر دھوکا دینا چاہتا ہے کہ میں نے تو صرف اہل بیت کے مقبرے ہی مسمار کئے ہیں، اگر امام مبین آیا تو وہ شیخین کی قبریں بھی اکھاڑ کر

سلہ جس وقت زار روس نے روضۂ مبارک امام رضا علیہ السلام پر گولہ باری کرائی ہے اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ جاہ و جلال والا شہنشاہ ایک دن کتے کی موت مرے گا، اور اس کا کروفر سب خاک میں مل جائے گا،

سلطنت روس کی ہولناک تباہی دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

پھینک دے گا، مسلمان بے وقوف نہیں ہیں، انہیں خبر ہے کہ امام مین زیدی شیعہ ہے، اسکے مذہب میں شیخین کے لیے قرار واقعی عزت و احترام ہے، یہاں تو کوئی شیعہ بھی ان قبروں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا جن کو ان کے سردار علیؑ نے ہاتھ نہیں لگایا یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ کو پڑھنے کے بعد کون ایسا شیعہ ہو گا جو رسول کی خواب گاہ میں کدال بازی کرے پھر زیدی جو خلفاء ثلاثہ کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کبھی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔"

اب میں دو ایک باتیں شیعوں سے بھی کرنا چاہتا ہوں :-

اے شیعو ! کیا بقول حسن نظامی تم اہلبیت کے زبانی طرفدار ہو؟ کیا تمہاری محبت مجلسوں کے جلسوں ہی تک محدود ہے؟ کیا یَا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا کا دعویٰ صرف لوگوں کے دکھانے ہی کے لیے کیا جاتا ہے؟ کیا دنیا میں اس سے بدتر بھی زمانہ آنے والا ہے؟ ارے ! "خاتونِ جنت، مظلومۂ جنت البقیع" کی روح هَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَنْصُرُنَا وَهَلْ مِنْ مُغِیْثٍ یُغِیْثُنَا کے نعرے بلند کر رہی ہے، خدا بنی فاطمہؑ اور ان کے شیعوں کی غیرت کا امتحان لے رہا ہے، کیا دنیا میں آلِ محمدؐ کا کوئی سچا دوست باقی نہیں رہا؟ کیا فاطمہؑ کے نام پر سید کہلانے والے لوگ اس قدر بے غیرت ہو گئے کہ وہ

اپنی جدۂ امجدہ کی توہین آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اے بنی فاطمہؑ کی عورتو! تم بی بی کی نیاز مردوں سے چھپاتی ہو، وہ بجھے وحشی اُسکے روضے میں داخل ہو گئے، آہ! اُنھوں نے سنہ دل زخموں کو ہرا کر دیا، وہ بی بی جس کے پہلو پر کسی نے در گرایا تھا آج اس کی قبر اینٹوں کے انبار کے نیچے دبی پڑی ہے اور اُسکے گرد اگرد امام حسنؑ، امام محمد باقرؑ امام جعفر صادقؑ اور سارباں آل محمدؐ امام زین العابدین علیہ السلام کے مزارات سربسجود پڑے ہیں؛

اے شیعو! تمھارے پہلو میں دل ہے یا نہیں، سینے پہ ہاتھ رکھکے کہنا کہ اگر تمہارے کسی عزیز کی قبر اس طرح برباد کی جاتی تو تمہاری کیا حالت ہوتی لو اُٹھو اور کم از کم جلسے کر کے اپنی گورنمنٹ کو یہ سُنادو کہ اب ہمارے صبر کی حد ہو گئی، ہم نے سب کچھ کھو کے بالآخر یہ سبق حاصل کر لیا کہ کمزور قوم کے جذبات کا کوئی احترام نہیں کرتا۔

اے برطانیہ! اگر تجھ کو ہمارے جذباتِ وفاداری کی کچھ قدر ہے تو بین الاقوامی قاعدوں کے ذریعے سے ابن سعود کو تنبیہ کر کہ وہ مآثر متبرکہ کی تعمیر کی اجازت دے اور آئندہ ایسی حرکات سے باز آئے ورنہ ہمیں اجازت دے کہ ہم ماتیوں کا ایک گروہ بنا کر مدینہ اور مکہ جائیں، اپنی آنکھوں سے

اُن آثار کی تباہی دیکھیں اور اُن پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔

مجھے یقین ہے کہ گورنمنٹ ایک مظلوم فرقے کی صدا پر ضرور لبیک کہے گی

ہم نہیں چاہتے کہ جزیرۃ العرب پر کسی غیر مسلم طاقت کا اقتدار رہے، لیکن جس طرح شریف علی کو حجاز کے معاملے میں تنبیہ کر دی گئی تھی ۱؎ اسی طرح ابن سعود کو بھی تنبیہ کی جا سکتی ہے، کیونکہ ابن سعود برطانیہ کے احسانات میں جکڑا ہوا ہے، وہ کبھی اس حکم کو ٹھکرا نہیں سکتا۔"

۱؎ برطانیہ کی حکمت عملی عجیب ہے، جنگِ عظیم کے دوران میں اس نے ایک طرف تو شریف حسین پر ڈورے ڈالے اور دوسری طرف ابن سعود سے ساز باز کی، کرنل لارنس شریف کو ایک عظیم الشان سلطنت عربیہ کے سبز باغ دکھاتے رہے اور فلبی نے ابن سعود کو آزاد وہابی حکومت کا لالچ دیا، جب جنگ ختم ہوئی اور جزیرۃ العرب کے حصے بخرے ہونے لگے تو شریف حسین نے غل و شور مچایا، اور اصرار کیا کہ مجھ سے جو وعدے کیے گئے تھے وہ پورے کیے جائیں، اس کی سزا انگریز نے یہ دی کہ ابن سعود کو اس کے سر پر مسلط کر دیا، شریف حسین کو شکست ہوئی اور وہ برطانوی جہاز پر جزیرۂ قبرص کی طرف روانہ ہو گئے۔

کچھ دنوں ان کے بیٹے علی نے مزاحمت کی، آخر بس نہ چلا تو انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اسی چند روزہ حکومت کے دوران میں انگریزوں نے شریف علی کو تنبیہ کی تھی۔

مصنف کہتا ہے کہ اسی طرح انگریز اب ابن سعود کو تنبیہ کر سکتے ہیں۔

پنجاب شیعہ کانفرنس میں

مولانا سید ابن حسن صاحب ضعیمی جارچوی مجتہد پیش امام سندھ کی

پُر زور فاضلانہ اور بصیرت افروز تقریر

جناب صدر و حاضرین جلسہ!

پروگرام میں میرے نام کے سامنے "وعظ" کا لفظ لکھا ہوا ہے
شاید آپ کو یہ خیال ہوگا کہ اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح میں بھی اسٹیج
پر آ کر آپ حضرات کو فضائل اور مصائب کے چھلکتے ہوئے جاموں سے سیراب
کرونگا، میری تقریر ایک فصیح و بلیغ عربی خطبے سے شروع ہوگی، اور
وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ
پر اس کا خاتمہ ہوگا۔

حضرات! نہ تو کانفرنسوں کے اسٹیج اس قسم کی خالص مذہبی تقریروں
کے لیے موزوں ہیں اور نہ میں اپنے آپ کو وعظ و پند کرنے کا اہل سمجھتا ہوں

اسلام سراسر پیغامِ عمل ہے اور اسی پیغام کو آپکے کانوں تک پہونچانے کے لیے میں آپکے سامنے اس وقت کھڑا ہوا ہوں۔

حضرات! کبھی آپنے اس امر پر بھی غور فرمایا ہے کہ اس نمائش گاہِ مذاہب میں آخر اسلام کی آمد کی کونسی ضرورت تھی؟ اسلام سے پہلے دُنیا میں درجنوں مذاہب موجود تھے، ایک طرف یہودیت و نصرانیت کا دَور دَورا تھا، دوسری طرف مجوسیت، بُدھ دھرم، جین دھرم، اور ہندو مت کوس لمن الملک بجا رہے تھے، ہر ایک مذہب کے پاس ایک فلسفۂ اخلاق تھا وہ حیاتِ دُنیا اور نجاتِ آخرت کے لیے ایک دستور العمل رکھتے تھے، جو عملاً قریب قریب ہی تھا جو اسلام نے پیش کیا، جھوٹ، زنا، چوری، غیبت تمام مذاہب میں حرام تھی، صداقت، ایثار، قربانی وغیرہ کی ہر مذہب تعلیم دیتا تھا، پھر بتائیے تو سہی کہ اسلام کی آخر دُنیا کو کون سی ضرورت تھی؟ کیا ربّ العالمین جدت پسند ہے؟ اور نت نئے مذہب بنا کر دُنیا میں بھیجتا رہتا ہے؟ یا اُس کو ہنگامہ آرائی کا شوق ہے کہ ابھی ایک مذہب کی تبلیغ ہونے نہیں پاتی کہ دوسرا نبی اور دوسرا مذہب بنا کر کھڑا کرتا ہے، وہ کبھی تو کوہِ طور پر توریت نازل کرتا ہے، کبھی داؤد کو زبور دے دیتا ہے، پھر زیتون کے پہاڑ پر کنواری مریم کے اکلوتے بیٹے کو محبت اور صلح کا اچھوتا سبق پڑھا دیتا ہے، اور کچھ دنوں بعد فاران کی

چوٹیوں پہ نورِ وحدت کی تجلی ڈالتا ہے، اور غارِ حرا میں بیٹھ کر عبادت و فکر کرنے والے کو ایک ہیجان آفریں اور تزلزل خیز پیام دے کر باہر نکالتا ہے۔

حضرات! حقیقت یہ ہے کہ مذہب عقیدے اور تھیوری کا نام نہیں، وہ عمل اور صرف عمل ہے، جب کبھی دُنیا نے مذہب کا مفہوم بدل دیا اور اُس کو عمل کے بجائے عقیدہ بنا کر رکھ دیا، اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور اُس نے نئے مُصلح اور ریفارمر کو دنیا میں بھیجا۔ کفر کی گھنگھور گھٹاؤں میں جب اس آفتابِ نبوت کی شعاعیں چمکیں جس نے اُفقِ عرب پر روشن ہو کر تمام عالم کو منور کیا، اُس وقت مذاہبِ عالم بہت بُری حالت میں تھے، یہودیت احبار اور ربیوں کے ہاتھوں ذبح ہو چکی تھی، عیسائیت پاپائے روم کی آغوش میں اپنی عمر کی آخری سانسیں لے رہی تھی، مجوسیت، بدھ مت اور ہندو دھرم اپنے مذہبی پیشواؤں کی تنگ خیالیوں کے تختۂ مشق بن کر رہ گئے تھے، مذہب سرمایہ داروں کا ایک کھلونا تھا اور مزدوروں اور غریبوں پر اس کی آڑ میں ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے، مذہبی دُنیا میں نہ تو قوتِ عمل تھی اور نہ قوتِ حیات، شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک ہندوستان، ایران، یونان، عرب، غرض تمام عالم میں مذہب توہمات کا دوسرا نام تھا، اہلِ ہنود کروڑوں دیوتاؤں کے سامنے سر جھکاتے تھے، یونان میں ہر شہر، ہر جنگل

ہر پہاڑ کا جدا گانہ خدا تھا، یہودی خدائے قدوس کو چھوڑ کر شہیدوں اور ولیوں کے پرستار بن گئے تھے، عیسائی زندہ پوپ کے علاوہ لاتعداد حاریوں، نام نہاد مذہبی پیشواؤں کو وحدہٗ لاشریک کا مثل و شریک جانتے تھے، یہ تو عقیدوں کا حال تھا، رہا عمل تو اُس کی طرف کسی کو توجہ بھی نہ تھی، نظام سوسائٹی بالکل خراب حالت میں تھا، سرمایہ دار مزدوروں کا خون چوستے تھے، جاہل اور چالاک انسان بُتجے اور قبائیں پہن کر نیچے انسان پر ناجائز حکومت چلا رہے تھے، مندر کلیسا اور خانقاہیں ایسے ہزاروں پیشہ ور انسانوں سے بھری پڑی تھیں جو اپنے آپ کو مافوق العادت انسان سمجھ کر اپنے بھائیوں اور خدا کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے، روحانیت کی تعلیم مفقود ہو گئی تھی، اور اُس کی جگہ انسان پرستی کا سبق پڑھایا جاتا تھا، سوسائٹی میں سرمایہ دار اور چالاک لوگ بڑے سمجھے جاتے تھے، اور محنتی جفاکش مزدور ذلیل تھے، ہر ملک کے باشندے دوسرے ملک والوں کو ذلیل سمجھتے تھے، یونانی خادر زیوس[1] کے ماننے والے یونانی اپنے سوا سب کو (BARBARIAN) وحشی سمجھتے تھے، ہندوؤں کی نگاہ میں بھارت ورش سے دُور رہنے والا اور تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو نہ ماننے والا انسان ملکش تھا، عرب اونٹوں کا دودھ پینے والے

---

[1] ZEUS یونان کا سب سے بڑا دیوتا۔

خانہ بدوش عرب، فتنہ پسند، جنگجو، امن شکن اور جاہل عرب اپنے سوا سب جہان کو عجم سمجھتے تھے۔

یہ تو جُدا جُدا ملکوں کی حالت تھی، ایک ہی ملک، ایک ہی شہر، ایک ہی قصبے کے باشندوں میں بھی مراتب کا تفاوت تھا، کوئی برہمن تھا کوئی چھتری، کوئی ویش تھا، کوئی شودر، پھر ان مختلف ذاتوں میں بھی سرمایہ داری کے لحاظ سے مدارج اور مراتب تھے، جو زیادہ روپیہ پیسے والا تھا وہ زیادہ معزز تھا، جو غریب تھا وہ نہ صرف دُنیا بلکہ دین میں بھی ذلیل تھا

اسلام آیا اور اُس نے توحید کا سبق دُنیا کو پڑھایا، اُس نے صاف اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا دیا کہ تمام عالموں کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے، کالے، گورے، حبشی، فرنگی، عرب، عجم، قریشی، ہاشمی، ہندی چینی، ایرانی غرض سب کو اُسی وحدہٗ لاشریک نے پیدا کیا ہے، اس ایک خدا کے بندے اسی طرح آپس میں برابر ہیں جس طرح ایک باپ کے مختلف فرزند رنگ، روپ، قومیت، جنسیت، سرمایہ اور مزدوری کے لحاظ سے تمہارے اندر کوئی فرق نہیں، ہاں عمل ہے جو انسانوں میں امتیاز پیدا کر سکتا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ	اے لوگو ہم نے تم کو مرد و عورت
إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن	سے پیدا کیا، اور گروہوں اور
ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ	قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ	پہچانے جاؤ، اللہ کے نزدیک
لِتَعَارَفُوْا اِنَّ	تم میں سے معزز و ممتاز وہی ہے
اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ	جو زیادہ پرہیزگار اور عمل والا ہے
اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ	بے شک اللہ سب باتوں کا
اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ	جاننے والا ہے، اور اُسے سب
(القرآن)	خبریں ہیں۔"

اس آیت کے نزول نے نظامِ سوسائٹی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، سلطانی و ملوکیت، پیری اور مرشدی کے پُرانے بُت ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے، مساوات اور حریت کا جو مکمل سبق اسلام نے پڑھایا وہ دُنیا کا کوئی مذہب نہ پڑھا سکا توحید[1] جس کی تبلیغ کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دُنیا میں آئے، دراصل

---

[1] غور سے دیکھئے تو تمدن و تہذیب پر عقیدۂ توحید کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے، جب تک بنی آدم بہت سے خداؤں کو مانتے رہیں گے ان میں اتحاد اور اشتراک پیدا نہیں ہو سکتا، نظریۂ توحید دُنیا کی قوموں کو ایک ایسا مرکز عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اندر وحدتِ خیال اور وحدتِ عمل پیدا ہو سکتی ہے۔

اقوامِ یورپ نے اپنی قومیت کی بنیاد وطن پر رکھی ہے اور وطن کو جغرافیائی حدود سے تنگ بنا دیا ہے، اسی لیے آج یورپ عرصۂ محشر بنا ہوا ہے۔ اسلام نے قومیت کی بنیاد "نظریۂ توحید" پر رکھی تاکہ کالے گورے، ادنیٰ اعلیٰ اور مغربی مشرقی کے لیے دست و گریبان ہونے کا موقع ہی نہ رہے۔ پھر وہ قومیں جو باد و برق، آفتاب و ماہتاب، دریا اور پہاڑ کو معبود مانتی ہیں، کبھی سائنس میں ترقی نہیں کر سکتیں۔ اسلام نے ایک اللہ کا تصور پیدا کیا اور بتایا کہ اس قادرِ مطلق کے سوا ہر چیز انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اگر انسان چاہے تو عقل و فراست کے زور سے ان کو اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے، اب لگا انسان عقل کے گھوڑے دوڑانے، دریاؤں کے پانی سے بجلی پیدا کی، بھاپ سے انجن چلائے، آفتاب کی شعاعوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے حرارت حاصل کی۔ یہ ترقی اسی کا ثمرہ ہوا...... (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

یہی فلسفۂ مساوات تھی، دگرنہ دُنیا ایک خدا کو مانے یا دو کو یا بیس کروڑ دیوتاؤں کی پرستش کرے اُس سے بظاہر کوئی بھی نقصان نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ توحید "رُوحِ تمدن" ہے، نظامِ مجلس بغیر اسکے مکمل ہی نہیں ہو سکتا، مساوات کی مکمل تعلیم اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک ہم یہ نہ مان لیں کہ ہم سب ایک ہی قادر و توانا کے بندے ہیں، مختلف بادشاہوں کی رعیت میں ضرور تفاوت ہوتا ہے، اسلیے مختلف خداؤں کے بندوں میں امتیاز ضروری ہے، بڑے خدا کے بندے بڑے، چھوٹے دیوتاؤں کے بندے چھوٹے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے یونانیوں کو باوجود عقل و ذکاوت کے دوسروں کو ذلیل سمجھنے پر مجبور کیا اور رومیوں کے دلوں میں بیجا تفوق اور اقتدار کا خیال پیدا کر دیا، حبشی تمام مہذب قوموں کے نزدیک صرف اسی لیے غلامی کے قابل تھے کہ وہ اجنبی خداؤں کے ماننے والے تھے دگرنہ فاندزیوس کا ماننے والا یونانیوں کی سلطنت میں، اور جوو JOVE

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ...... اب روحانی فائدہ سنیے، نظریہ توحید کی اشاعت سے پہلے آدمی بھوت، پریت، دیو اور پری خدا جانے کس کس چیز کا قائل تھا اور ہر وقت ان کے خوف سے لرزہ براندام رہتا تھا، اس طرح روحانی طور پر انسان ان پوشیدہ چیزوں کا غلام بنا ہوا تھا لا الٰہ الا اللہ کہہ کر اسلام نے ایک طرف کل دیوی دیوتاؤں کا انکار کر دیا دوسری طرف سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ کہہ کر انسان کو کائنات کی بادشاہی بخشی۔ اور بتایا کہ تم ہر چیز کو تسخیر کر سکتے ہو، توحید کے اس عقیدے سے آزاد ہو کر انسان نے جو ترقی کی ہے وہ اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں، موحد انسان صحیح معنوں میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے اُس کا خیال، اُس کا عمل، غرض ہر چیز آزاد ہو جاتی ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے فرزند امام حسنؓ سے کیا خوب فرمایا تھا:-

يَا بُنَيَّ لَا تَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ وَقَدْ جَعَلَكَ اللّٰهُ حُرًّا۔ | بیٹا کسی کے غلام نہ بنو کہ اللہ نے تم کو آزاد پیدا کیا ہے۔

کا قائل رومیوں کی حکومت میں، خداوند بنی اسرائیل کے خدا کا بندہ یہودیوں کی نظروں میں کبھی غلام نہیں بن سکتا۔

اسلام نے سب سے پہلی مرتبہ اس نظریہ کو پیش کیا کہ اللہ ایک ہے اور اسکے تمام بندے مرتبے میں برابر ہیں

اَلْجَنَّةُ لِمَنْ اَطَاعَ	جنت ہر اُس شخص کے لیے ہے
اللهَ وَلَوْ كَانَ	جو اللہ کی اطاعت کرے اگرچہ وہ
عَبْدًا حَبْشِيًّا وَالنَّارُ	غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو اور دوزخ
لِمَنْ عَصَى اللهَ وَ	ہر اُس شخص کے لیے ہے جو اللہ کی
لَوْ كَانَ سَيِّدًا	نافرمانی کرے اگرچہ وہ سید قرشی
قُرَشِيًّا	ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کا یہ بلند نظریہ صرف کتابوں ہی میں موجود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں نے اس کو اپنے عمل سے دُنیا کے سامنے پیش کر کے دکھایا ہے، مسجد میں چل کر دیکھئے کالے اور گورے، غریب اور امیر سب ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر خدائے قدوس کے سامنے سر جھکاتے ہیں ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

وہ لوگ جو اسلامی دُنیا کے رہنما تھے اپنے قول اور فعل دونوں سے منادی کرنے لگے

بھولے ہوئے سبق کو یاد دلاتے تھے تاریخ کی ورق گردانی کیجئے اور دیکھئے کہ فاطمہ کے گھر میں ایک شریک کار ہے جو اُس جاہلیت کی اصطلاح میں لونڈی اور کنیز کے نام سے پکاری جاتی تھی، ایک دن وہ کام کرتی ہے تو دوسرے دن جناب فاطمہؑ کام کرتی ہیں، علیؑ کا غلام قنبر اپنے آقا سے اچھا لباس پہنتا ہے، رسول کا غلام زید ابن حارثہ متبنیٰ بنالیا جاتا ہے اور عرب کی تمام روایات کے خلاف اپنی پھوپھی زاد بہن سے اس کی شادی کردی جاتی ہے اور رسولؐ کی غلامی میں اُسے وہ لطف آتا ہے کہ وہ ہزاروں آزادیوں کو اُس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور آزادی کے بجائے غلامی کو ترجیح دیتا ہے۔

مسلمانوں نے غلامی کی قبیح رسم کو مٹا کر غلاموں کو شریک کار اور رفیق عمل کے بلند مرتبے تک پہونچا دیا، ہندوستان میں خاندانِ غلامان کی بادشاہت کا ایک طویل سلسلہ اس حقیقت کو واضح کرسکتا ہے کہ اسلام میں غلام کس کو کہتے ہیں۔

حضرات! اسلام محض کسی عقیدے یا فارمولے کا نام نہیں ہے وہ ایک پیغام عمل ہے، جو لوگ عمل نہیں کرتے اُن کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، دُنیا کو ایسے مسلمانوں کی ضرورت نہیں جو شب و روز سجادوں اور مُصلّوں پر بیٹھ کر تسبیح گردانیوں میں مشغول ہوں اور میدانِ عمل میں

کچھ بھی نہ کریں، ہم اُس علیؑ کے ماننے والے ہیں جو یہودیوں کے باغ میں مزدوری
کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا، مدینے کے فقیروں اور غریبوں
کی پرورش کرتا تھا اور تبلیغِ دین کے کاموں میں بھی منہمک رہتا تھا ہم اُس
رسُول کے پیرو ہیں جو صحابہ کے ساتھ پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودتا تھا،
آڑے وقت میں مسلمانوں کے کام آتا تھا اور صلح و اطمینان کے وقت اُنکی
روحانی اصلاح کرتا تھا، وہ لڑائی کے وقت اعلیٰ درجے کا جرنیل، منبر پر
ایک فصیح اللسان خطیب اور مسندِ قضا پر ایک بافہم جج تھا۔

جب ہم نے بیت المال کی روٹیاں کھانے والے سلاطین کو اپنا
مذہبی پیشوا نہ مانا تو ہم آج اُن لوگوں کے سامنے کس طرح سر جھکا سکتے ہیں
جنھوں نے قوم کے بیکاروں کی جماعت میں اضافہ کر دیا ہے اور وہ قوم
کے ناخواندہ مہمان بنے ہوئے ہیں، جب ہم تاج و تخت کی قوت اور تیغ
و تیر کی شدت سے مرعوب نہ ہوئے تو آج استبداد پسند سرمایہ داروں یا قدامت پسند
راہبوں کا بے سرو پا گروہ ہم کو ترقی کی راہوں سے کس طرح ہٹا سکتا ہے،
جب اسلام عمل کا نام ہے تو ہم صرف انھیں لوگوں کو اپنا پیشوا سمجھ سکتے ہیں
جو اپنے قول کو فعل سے ثابت کرکے دکھا دیں۔

اسلام جیسا کہ دُنیا کو معلوم ہے سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست
آواز تھی، رسولُ اللہ اور اُن کے حقیقی جانشینوں نے کبھی دنیاوی جاہ و جلال

بیجا تفوق و اقتدار کی خواہش نہیں کی، وہ تخت و تاج کے مالک بن کر
بنی نوع انسان کے جائز حقوق غصب کرنا اور اپنے ذاتی مفاد کے خاطر
قوم کے افراد کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرا دینا سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے
وہ ہمیشہ مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے رہے اور اپنے معتقدین سے چندے
وصول کرنے کے بجائے اپنی کمائی سے اُن کی مدد کرتے رہے، مدینہ اور
کوفہ کی بیواؤں سے، وہاں کے یتیموں سے، وہاں کے مسکینوں سے محمد و
آلِ محمد کے ایثار کی حکایتیں سنو، بغداد، سامرہ اور طوس کے بے نواؤں
اور غریبوں سے ان حقیقی سردارانِ دین کی سخاوت کا حال دریافت کرو۔
حضرات : رسولِ اسلام اور ان کے حقیقی جانشینوں نے جو کچھ
کہا اُس پر خود عمل پیرا ہو کر دکھلایا، وہ دنیا میں اپنے اُسوۂ حسنہ کو
آنے والی نسلوں کے لیے ایک منارۂ ہدایت بنا کر چھوڑ گئے، آپ اور
ہم جو آئے دن اسلام اسلام پکارتے ہیں اور مزدوری سے نفرت اور
سرمایہ داری سے محبت کرنے کے عادی بن گئے ہیں، یا تو اسلام کے
اصلی مفہوم سے ناواقف ہیں یا جان بوجھ کر اُس کو بدنام کرتے ہیں۔
حضرات ! جس طرح نبی زادہ اور امام زادہ ہونا رہنمائے دین
بننے کے لیے کافی نہیں ہے اسی طرح ہم کسی کو صرف اسلیئے مذہبی پیشوا
نہیں مان سکتے کہ وہ خاندانِ اجتہاد سے ہے یا عراق کی سیر کر آیا ہے

ہم کو عمل کی ضرورت ہے اور جہاں ہم اُس کو پالیں گے ہمارا سر جھک جائے گا۔

امیرالمومنین علیؑ کے بلند مرتبہ "کیرکٹر" (اُسوۂ حسنہ) میں دُنیا کے لیے ایک درسِ ہدایت ہے، اُنھوں نے ساری عمر کبھی عیش و آرام کی پرواہ نہیں کی، بچپنے سے اپنی زندگی کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، اور جب تک جان میں جان رہی خدماتِ اسلام بجالاتے رہے، انھوں نے مسلمانوں سے کبھی فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی اور دُنیا جہان کے پیروں اور مرشدوں کی طرح خیرات کے ٹکڑوں پر نظر نہ ڈالی، ہوسکتا تھا کہ وہ کسی مسلمان سرمایہ دار کے باغ میں مزدوری کرتے، یا کسی "غنی" سے ضرورت کے وقت قرض لے لیتے، لیکن اُن کی غیرت نے کبھی اس بات کو گوارا نہیں کیا، وہ ان یہودیوں کے کھیتوں اور باغوں میں مزدوری کرتے رہے جو اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتے تھے، اور فاطمہؑ کی بہتّر پیوند والی چادر دشمنانِ اسلام کے گھر رہن ہوتی رہی اور ایک سے زیادہ مرتبہ تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنی۔

حضرات! مردوں میں تو ہمیشہ ریفارمر اور مصلح پیدا ہوتے رہے جن کا اُسوۂ حسنہ ان کے لئے قابلِ تقلید رہا لیکن صنفِ نازک کو مدّت سے ایک ہمجنس ریفارمر کی ضرورت تھی، جس کو سیّدۃ نساءالعالمین فاطمہ صدیقہ نے پورا کر دیا، اُنھوں نے دُنیا کی عورتوں کو عملاً بتا دیا کہ صنفِ نازک کے

فرائض کیا ہیں اور اُن کو حُسن و خوبی کے ساتھ کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے، نو[1] سال کی عمر میں شادی ہوئی اور اٹھارہ[2] سال کی عمر میں وفات پائی، مگر امورِ خانہ داری، اطاعتِ شوہر، تربیتِ اولاد کے زبردست نمونے اس قلیل مُدت میں انھوں نے دُنیا کے سامنے پیش کر دیے کہ آج صنفِ نازک ان پر جس قدر ناز کرے کم ہے، فاطمہؑ کی گود کے تربیت یافتہ بچے اسلام کے نجات دہندہ بنے اور ان کی آغوش کی پلی ہوئی لڑکیاں مصیبتوں کے سخت سے سخت میدانوں میں استقلال سے جمی رہیں، ان کی اولاد نے صحیح طور پر اسلام کو مٹنے سے بچا لیا، ان کے حُسنِ تربیت کا بیان کربلا سے پوچھیے کوفہ و شام کے قید خانوں سے دریافت کیجیے، اسلام کی مدافعانہ جنگیں اور تبلیغی جد و جہدیں فاطمہؑ اور بنی فاطمہؑ کی مرہونِ احسان ہیں، اور قصرِ اسلام کی بنیادیں بنی فاطمہؑ کے خون سے مضبوط کی گئیں ہیں۔

برادرانِ ملت! اسلام در اصل عمل کا نام ہے اور ہمارے پیشوایانِ دین حُسنِ عمل کی کیسی اعلیٰ مثالیں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں، پس اگر ہم شیعیانِ علیؑ

---

[1] سچ پوچھیے تو یادگار ائمہ قائم رکھنے کا اصل سبب ہی یہ تھا کہ ان کی سیرت کا ذکر ہمارے قوائے عمل میں حرکت پیدا کرے مگر وائے قسمت قوم یہ سمجھے بیٹھی ہے کہ ان بزرگ ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہمارے بس کی بات نہیں، مانا کہ آپ علیؑ اور حسینؑ نہیں بن سکتے، مگر کسی حد تک ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر سکتے ہیں، ہم سے تو کہا گیا تھا کہ

تخلقوا باخلاق اللہ

تم اپنے آپ کو خدائی اخلاق سے آراستہ کرو

اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم خاصانِ خدا کے اخلاق سے تو بہرہ مند ہونے کا شرف حاصل کریں، اللہ اللہ وہ لوگ بھی تھے جو اخلاقِ الٰہی کا اس قدر کامل نمونہ بن جاتے تھے کہ لوگوں کو اُن پر ...... (بقیہ آئندہ صفحہ پر)....

[2] مشہور روایت تو یہی ہے مگر بعض راویوں نے حضرت کا سنِ مبارک زیادہ لکھا ہے۔

اور پیروانِ آلِ محمد کہلاتے ہیں تو دُنیا میں عمل کے کارنامے پیش کریں، ورنہ کانفرنسیں فضول ہیں، مجلسیں بیکار ہیں، امام حسینؑ کے واقعات اس لیے آپکے سامنے پیش نہیں کیے جاتے کہ آپ چار آنسو بہا کر اپنے گھر جا بیٹھیں؛ بلکہ اس سے یہ مطلب ہے کہ آپکے اندر ایثار، قربانی، جرأت، شجاعت، صبر اور استقلال کا ایک جذبہ پیدا ہو۔ سیرتِ ائمہ کو اس لیے آپکے سامنے بیان نہیں کیا جاتا کہ آپ جا و بیجا صلوات کے نعرے لگا کر چُپ ہو رہیں، بلکہ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ اُن کے اعلیٰ کیرکٹر سے سبق حاصل کریں، امام حسینؑ اور ائمہ طاہرینؑ کے واقعات زندگی سے تیرہ سو سال میں آپنے کیا سبق حاصل کیا۔ اس کے امتحان کا یہ وقت ہے کہ سرزمین[1] حجاز پر ایک زیدشاہی کا تسلط ہے اور جیرانِ رسولؐ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ...... خدا ہونے کا دھوکا ہو جاتا تھا، کیا ہم محمدؐ و آلِ محمدؐ کی سیرت پر اس قدر عامل نہیں ہو سکتے کہ ہم پر آلِ محمدؐ ہونے کا شبہ ہونے لگے، سادات کرام خصوصیت کے ساتھ اس نکتہ پر غور فرمائیں۔"

[1] یہ تقریر اُس زمانے میں ہوئی تھی جب سلطان ابن سعود نے سرزمین حجاز کو فتح کر کے شعائرِ دینیہ کو مسمار کرنا شروع کیا تھا، اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں فطری طور پر ایک بے چینی پھیلی ہوئی تھی، اور ابن سعود کے خلاف عام طور پر اظہارِ نفرت کیا جا رہا تھا۔

دُنیا جانتی ہے کہ مسلمان ائمہ طاہرینؑ کی پرستش نہیں کرتے، نہ ان کے مزاروں کو پوجتے ہیں، یہاں بھی مزار ایک تاریخی چیز تھی، اور آثار قدیمہ میں شامل تھے، ان کو مسمار کرنا عہد قدیم کی وحشت اور بربریت کی یاد تازہ کرنا تھا، اگر نجدیوں کے خیال میں ان مزاروں کی زیارت بدعت تھی تو وہ زیادہ سے زیادہ اس کی مخالفت کر سکتے تھے؛

فاطمی خاندان سے محبت رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہیں کہ مزار تو سب یکساں ہیں، یہ کیا وجہ ہے کہ فاطمی ائمہؑ کے مزاروں کو تو مسمار کر دیا گیا اور حضرت رسول کریمؐ کے مزار کو باقی رہنے دیا گیا ان کے خیال میں یہ وہی قدیم عداوت کا مظاہرہ تھا جو عام طور پر عرب کی بعض نسلوں کو فاطمی گھرانے سے رہی ہے۔

طرح طرح کے مصائب کا شکار بنائے جا رہے ہیں۔

اے بنی فاطمہؑ! اے فرزندِ رسولؐ کہلانے والو!! آپ کے لیے اس سے زیادہ مصیبت کا اور کونسا وقت آئے گا کہ آپ کی جدہٗ امجدہ جناب سیدہ طاہرہؑ کا سرِ فلک مزار توپوں اور بندوقوں کا نشانہ بنایا گیا، سیدنا امام حسنؑ، امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے مقبرے کھود کر پھینک دیے گئے، مجھے بتا دیجئے کہ وہ غیرتِ ہاشمی کب جوش مارے گی، اور شجاعتِ حیدری دکھانے کا اور کونسا وقت آئے گا۔ مجھے صاف کہنے میں صاف صاف بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے تو دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا بے غیرت نظر نہیں آتا کہ اُس کی ماں کا مزار بے عزتی کے ساتھ برباد کر دیا جائے اور وہ خاموش بیٹھا رہے، رسول اللہؐ نے فرمایا تھا فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّي مَنْ آذَاهَا فَقَدْ آذَانِي وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللهَ وَمَنْ آذَى اللهَ فَقَدْ كَفَرَ دیکھو اُمتِ محمدیہ نے رسولؐ کی پارۂ جگر کی کیا توقیر کی، پیغمبرِ اسلامؐ کی دلی خواہش کو کس طرح پورا کیا۔ افسوس! جس بی بی کے نیاز کے کھانے کو ہماری عورتیں مردوں سے چھپاتی ہیں اُسکے مزار میں بے ادب اور وحشی نجدی کدالیں لے کر داخل ہوئے شیعیانِ علی زور زور سے منتیں کرتے رہے اور اہلِ نجد کی شرربار توپوں نے آناً فاناً میں رسولؐ کی چہیتی بیٹی کے مزار کو اینٹوں کا ڈھیر بنا دیا، اے مسلمانو! اے جعفریو! کیا یہ

غیرت کا مقام نہیں؟ کہ شردھانند[1] کی یادگار تو قائم کی جا رہی ہو اور آپ کے اماموں کی یادگاریں دُنیا سے مٹائی جائیں۔

اے فاطمہ کے نام سے فائدہ اُٹھانے والے فاطمیو! اے خمس کو اپنا حق بتانے والو! کراچی میں حجاج نے یہ بیان کیا کہ جب[2] ہم جنت البقیع میں جناب سیدہ کے مزار کے قریب پہونچے تو ہم نے وہاں سے رونے کی آواز آتی سُنی۔ اے زمین پھٹ جا! اے آسمان گر پڑ! کہ رسولِ اسلام کی اکلوتی دختر آج مسلمانوں کو رو رو کر پکار رہی ہے اور بزبانِ حال کہتی ہے:-

"کیا دنیا میرے باپ کا کلمہ پڑھنے والوں سے خالی ہو گئی؟ کیا اب اُلفتِ رسول وآلِ رسول رکھنے والے مسلمان دُنیا میں نہیں رہے؟ اگر ہیں تو اُٹھیں اور ہمیں ان مصیبتوں سے بچالیں جو وحشیانِ نجد ہم پر دیدہ و دانستہ ڈھا رہے ہیں۔"

دوستو! اہلِ نجد نے اپنی بندوقوں کی نالیوں کو خدیجۃ الکبریٰ کے مزار پر رکھ کر یہ آوازیں دیں کہ اے خدیجہ! اگر اب تیرے اندر کوئی طاقت ہے

---

[1] اس سال سوامی شردھانند کی یادگار قائم کرنے کے لیے چندہ کیا جا رہا تھا۔
[2] ممکن ہے کہ مادہ پرست لوگ اس بیان کو تسلیم نہ کریں، مگر روحانیات (SPRITUALISM) کے ماننے والے اس کا انکار نہ کر سکیں گے۔ مقرر نے حاجیوں کی زبانی اس واقعہ کا ذکر سنا تھا اور موقع و محل کے لحاظ سے اس کا تذکرہ مناسب سمجھا۔

تو اپنے آپ کو بچالے، اور مسلمانوں سے کہتے ہیں "آؤ اپنے معبودوں[1] کی کرودیاں کر دیکھ لو کہ وہ اپنی حفاظت کی طاقت نہیں رکھتے۔"

مسلمانو! دشمنانِ نجد کی گستاخیاں اب حد سے گزر گئیں، وہ گنبدِ خضرا پر دست درازی کرنا چاہتے ہیں، اب سارے حجاز میں رسول کا قبہ رہ گیا ہے اور وہ بھی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے، کیا اب بھی آپ کی طینت اور حمیت جوش میں نہ آئے گی؟ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ تلواریں لے کر اٹھیں اور جہاد کے لیے حجاز کی طرف جائیں، آپ ہندوستان ہی

---

[1] غلط یا صحیح اہلِ نجد کا یہ خیال ہے کہ مسلمان سچ مچ ان بزرگانِ دین کو اپنا معبود مانتے ہیں، اسی وجہ سے وہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو مشرک سمجھتے ہیں۔ شرک اور تعظیم میں اس قدر باریک فرق ہے کہ سطحی نظر سے وہ ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے، شرک کے معنی ہیں کہ کسی چیز کو ذات و صفات میں خدا کا شریک ٹھہرانا اور تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ بزرگ ہستیوں کا حسبِ مراتب احترام کرنا۔ اسلام بے ادبوں کا مذہب اور احسان فراموشوں کا دین نہیں ہے کہ ہم کو بزرگوں کی تعظیم اور ان لوگوں کے احترام سے روکے جنھوں نے اسلام پر احسان کیا ہے۔ انسان فطرتاً نقال اور تقلید پسند واقع ہوا ہے، وہ دوسروں کو دیکھ کر اور ان کے واقعاتِ زندگی سن کر عمل کی طرف راغب ہوتا ہے، اولیاء دین کے مزارات پر جاکر "مشاغلِ دنیوی میں غرق" مسلمانوں کی روح جھٹک پڑتی ہے، غفلت کے پردے اس کی نگاہوں سے اٹھ جاتے ہیں، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ راہِ خدا میں شہید ہو کر انسان حیاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے، اس کے دل میں شوقِ خدمت اور جان دے کر زندۂ جاوید بننے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ بس شہدائے راہِ خدا کے مزاروں پر حاضر ہونے کا یہی مطلب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جاہل اور توہم پرست لوگوں کو چھوڑ کر ہر سچا مسلمان اسی نیت سے وہاں حاضر ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح بھی ہے کہ لوگ ان مزاروں پر جاکر بدعات اور شرک کے مرتکب ہوتے تھے تو اس کو روکنے کا طریقہ یہ نہ تھا کہ ان مزارات کی توہین کی جائے اور ان عالیشان تاریخی عمارتوں کو مسمار کر دیا جائے، بلکہ ان زائروں کو تنبیہ کی جاسکتی تھی اور اگر وہ نہ مانتے تو ان عمارتوں میں ان کا داخلہ روکا جاسکتا تھا، کروڑوں روپے کی عالیشان عمارتوں کو مسمار کرنا اور شہدائے راہِ خدا کی آخری آرامگاہوں کی اس طرح توہین و تذلیل کرنا وحشت و بربریت کی نمایاں مثال ہے۔ اگر مسلمان متحد ہو کر دو چار سال التوائے حج کی تحریک کو کامیاب بنا دیتے تو اس بے ادب قوم کے ہوش و حواس ٹھکانے آجاتے مگر مسلمان آج دنیا میں ہیں کہاں .... (بقیہ آئندہ صفحہ پر) ....

میں رہ کر بہت کچھ کر سکتے ہیں، میری یہ استدعا ہے کہ آپ شبانہ روز اللہ کی درگاہ میں ظالمین نجد کے اخراج کی دعائیں مانگیں، امسال التوائے حج کی تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں، کیونکہ یہی ایک حربہ ہے جس سے ہم ابن سعود پر اثر ڈال سکتے ہیں، امسال حج کو جانا ظالم کو اُس کے ظلم میں مدد دینا اور اُس کے تسلطِ حجاز کو تقویت پہنچانا ہے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ انجمن خدام الحرمین اور انجمن تحفظ مآثر متبرکہ شیعہ کا فرض کہ مدد دیں جو ہندوستان میں وہابیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتی ہے، وہابی پروپگنڈا جس زور و شور سے ملک ہند میں جاری ہے اُس کا

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ..... راقم الحروف نہ تو وہم پسند ہے نہ قبر پرست، ہاں اتنا جانتا ہے کہ انسان مجموعہ ہو دل و دماغ کا، اس لیے ہر وہ مذہب جو عالمگیر ہونا چاہتا ہے اور ہر طبقہ کے لوگوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لینے کا متمنی ہے اس امر پر مجبور ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ دونوں کے لیے سامان مہیا کرے، صرف دماغ سے اپیل کرنے والا مذہب خشک فلسفہ ہو کر رہ جائیگا اور چند ذہنی عیاشوں کے سوا دوسرے لوگ اُس کی طرف التفات نہ کریں گے، اور صرف جذبات سے اپیل کرنے والا دین توہمات کے گورکھ دھندے سے زیادہ وقعت نہ رکھے گا، اسلام از بسکہ دین فطرت ہے اُس نے دونوں امور کا خیال رکھا ہے، ایک طرف بلند پایہ توحید کو پیش کیا ہے جس میں شرک کا شائبہ بھی نہیں ہے، دوسری طرف نماز، روزہ اور حج کے مراسم کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ انسانی جذبات کی بھی اس سے تسکین ہوتی ہے، اب غور کیجئے کہ حج کیا ہے اور کعبہ کی کیا اہمیت ہے؟ یہ اُس تاریخی واقعہ کی یادگار ہے جو ابراہیم و اسمٰعیل کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اور اس تاریخی واقعہ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی تعظیم قرآن نے ہمارے لیے ضروری قرار دی ہے تاکہ ہم کو معلوم ہو کہ خدا کے نام پر ایثار و قربانی کرنے والے لوگوں کی یاد کو خدا ہمیشہ تازہ رکھتا ہے کیونکہ ان کی یاد اصل میں خداوند عالم کی یاد ہے، چنانچہ قربانی کے اونٹ، ان کے گلے کے قلادے، صفا و مروہ ہر چیز کو شعائر اللہ قرار دیا ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم ضروری قرار دی ہے ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب اسی طرح کل وہ لوگ جو راہ خدا میں شہید ہوئے قابل تعظیم ہیں اور ان کی طرف منسوب ہو کر ہر چیز لائق احترام ہو جاتی ہے، بس مزارات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے ورنہ کون بے غیرت ہے جو ان کو خدا کا شریک ٹھہرائے اور ان کی پرستش کرے۔

لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سادہ لوح اور خالی الذہن مسلمان راہِ ہدایت سے ڈگمگا جائیں، ضرورت ہے کہ اس کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے۔

مسلمانو! ہم سب کو مرنا ہے اور ایک دن حوضِ کوثر پر رسول اللہ کو منہ دکھانا ہے، وہ یقیناً ہم سے پوچھیں گے کہ تم نے قرآن اور اہلبیت کے ساتھ کیا سلوک کیا، خدا کے لیے ایسا نہ ہو کہ آپ کو یہ جواب دینا پڑے کہ قرآن کو ہم نے کھونٹیوں پر ٹانگے رکھا اور اہلبیت کے مزارات منہدم ہوتے رہے، اور ہم ٹس سے مس نہ ہوئے

مسلمانو! ابھی وقت ہے سوچ لیجئے اور غور کر لیجئے کہ کل روزِ قیامت آپ رسول اللہ کو کیا جواب دیں گے۔

سرمایہ پرست مسلمانوں کی ذہنیت

"اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

غازی محمد علی کی سیاست دانی

کیا فتنۂ "تاتار بھی حق و باطل" کا معرکہ تھا؟

خدا مدیرِ "خاور" کو زندہ رکھے، آخر انھوں نے وہ بات کہہ ہی ڈالی جو مدت سے سچے مسلمانوں کے دماغ میں چکر لگا رہی تھی، خدا جانے ہمارے مولانا محمد علی نے "کربلا کی فیصلہ کن جنگ" کو کیا سمجھ رکھا ہے، کیا اُن کا یہ خیال ہے کہ دُنیا کے سب سے بڑے مدبر سیدنا امام حسینؓ کی یہ "یادگار تیغ آزمائی" اسلام کی اُن نام نہاد "مقدس جنگوں" کے مانند تھی جن کی تہ میں سنہری رُوپہلی مصلحتیں، حرص و لالچ سے بھرپور حکمت عملیاں پوشیدہ تھیں، مولانا کا حسبِ ذیل شعر ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تاریخی حقائق سے مُعرّا، معنویت سے دُور، روایت و درایت سے الگ ایک ایسی چیستان ہے جس کا حل کرنا ہمارا کام نہیں، تعجب ہے کہ وہ زبردست ہستی جو "کامریڈ" اور "ہمدرد" کی ادارت کے فرائض کے ساتھ ساتھ دُنیائے اسلام کی رہنمائی کی "بلا شرکتِ غیرے" دعویدار ہے، جس کو اپنی سیاست دانی پر بڑا ناز ہے، جو بانگِ دہل یہ اعلان کر رہی ہے کہ حقیقی اسلام موجودہ "سیاست" "عسکریت" اور "شہنشاہیت" سے جُداگانہ ایک "روحانی تمدن" ہے، حسینؑ کی عدیم النظیر شہادت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

مولانا اور اُن کے ہمخیال ایک مرتبہ پھر سُن لیں کہ کربلا کی جنگ سرمایہ اور مزدوری، حق و باطل، کفر و اسلام، نور و ظلمت کی پہلی اور آخری فیصلہ کن جنگ تھی، تاریخِ اسلام کیا بلکہ تمام عالم کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، اسلام ایک اور صرف ایک کربلا کے بعد زندہ ہوا ہے، نہ تو حسینی جہاد سے قبل اسلام پر ایسی مصیبت آئی تھی اور نہ اُسکے بعد وہ کبھی بھی اتنی سخت آزمائش میں مبتلا ہوا۔

فتنۂ تاتار دو حریص بادشاہوں کی جنگِ زرگری تھی، اس کو اسلام کی روحانیت سے کوئی تعلق نہ تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ ایک طرف وہ جابر و قاہر تاتاری تھا جس کی جبینِ نیاز انسانی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے جھکتی تھی، اور دوسری طرف وہ عیش پسند سلطان تھا

جو توحید پرست ہونے کے باوجود خدا کی بادشاہت کے مقابلے میں اپنی حکومت جمائے بیٹھا تھا، جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر حکم "خدائی قانون" کے برابر واجب التعمیل سمجھا جاتا تھا جو اپنے ہم جنسوں پر جابرانہ حکومت کرتا تھا، جو اللہ کے بندوں کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالے ہوئے تھا، جس نے مذہبی آزادی سلب کر لی تھی، جو معمولی اختلافِ عقائد پر ایک قوم کی قوم کو برباد کرنے کی قسم کھائے ہوئے تھا، جس کے حرم میں عورتیں بھیڑوں اور بکریوں کے گلے کی طرح بھری پڑی تھیں، جس کے خلوت خانے میں شراب کے دور چلتے تھے، جو وزیروں کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی تھا، قدرت کا ابدی قانون سب پر چلتا ہے، انکی گرفت کافر اور مومن سب کو آدباتی ہے:-

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ

جن میں سلطنت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہی ملک کے وارث بنتے ہیں۔

زہر اور تلوار کے بھروسے پر جب تک ہو سکا عباسیوں نے حکومت کی، اور جب قوتِ عمل ان کا ساتھ چھوڑ گئی اور سیاسی چالوں نے جواب دے دیا تو اپنے پیشروؤں کی طرح ان کو بھی دوسروں کے لئے تخت خالی کرنا پڑا، قدرت کا ایسا پرانا قانون ہے جس کی ہم عمری کا دعوے پہاڑ اور دریا ہی کر سکتے ہیں سنت اللہ التی قد خلت لن تجد لسنت اللہ تبدیلا

اگر مسلمانوں کو یہ حق تھا کہ وہ تاتار کی سرزمین کو خون سے رنگین کر دیں اور اُنکی حکومت کو برباد کر کے عربی حکومت کی داغ بیل ڈالیں، تو تاتاریوں کو بھی خلیفۂ وقت کی گوشمالی کرنے کا پورا استحقاق حاصل تھا۔ یہ اسلام اور کفر کی لڑائی نہ تھی بلکہ دو بادشاہوں کی جنگ تھی جو اتفاق سے مختلف عقائد رکھتے تھے، اگر اس موقع پر ہلاکو خاں کے بجائے کوئی مسلمان بادشاہ بغداد پر حملہ کرتا تو بھی صورتِ حال کچھ مختلف نہ ہوتی، ابن سعود کے حملۂ حجاز کی داستان آپکے سامنے ہے، طائف اور مکہ کے قتلِ عام کے واقعات آپ سُن چکے ہیں، کیا یہ ظلم و ستم کچھ کم ہے۔

مولانا ! آپ دُنیادار سلاطین کی نبرد آزمائیوں کا مقابلہ ایک خالص مذہبی جہاد سے کرتے ہیں، اور ایک عسکریت نواز ننگِ انسانیت کی شکست کو اسلام کی دوسری کربلا سمجھتے ہیں، ہلاکو خاں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھیں اور بغداد کے کرّ و فر کو خاک میں ملا کر اُلٹے پاؤں لوٹ گئیں، انھوں نے اسلام کے عقائد میں ترمیم نہیں کی، اُنھوں نے شراب پی پی کر رسُول کی جانشینی کا دعوے نہیں کیا، وہ لٹیروں کا ایک گروہ تھا، مال و اسباب لے کر چلتا بنا لیکن یزید کے عہدِ حکومت میں " متاعِ ایمان " لُٹ رہا تھا، " دولتِ دین " برباد ہو رہی تھی، اسلام کے گلے پر تلوار چلائی جا رہی تھی، ماں اور پھوپھی سے نکاح جائز کیا جا رہا تھا، شراب پی پی کر نماز پڑھنا مُباح سمجھا جاتا تھا

یزید بیرونی حملہ آور نہ تھا، وہ اسلام کا جائز خلیفہ، رسُول کا واجب التعظیم وارث اور مسلمانوں کا روحانی پیشوا مانا جاتا تھا، اُس کے اندر وہ تمام صفات موجود تھے جو ایک خلیفہ کے لیے ضروری ہیں، اجماع، استخلاف، غلبہ، شوریٰ غرض کون سی ایسی شرط تھی جو اُنکی ذات میں موجود نہ ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تحریریں پڑھیئے اور پھر غور کیجیے کہ اگر امام حسینؓ اپنی جان دے کر اسلام کو نہ بچاتے تو آج تمام دنیا میں کتنے سچے مسلمان ہوتے، یزید سرمایہ پرست اور عسکریت پسند شہنشاہ تھا اور اُس کا مقابلہ ایک حق پسند مزدور سے تھا جو دُنیا کو سرمائے کے بڑھتے ہوئے مظالم سے بچانے کے لیے پیدا ہوا تھا، برخلاف اسکے فتنہ تاتار محض ایک دُنیاوی جنگ تھی۔

کیا مولانا از راہِ مہربانی بتا سکتے ہیں کہ اسلام کب کب "کربلا" جیسے مصائب میں مبتلا ہوا، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ سر محمد اقبال تو یہ تحریر فرماتے ہیں سہ

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز
اے صبا، اے پیکِ دور افتادگاں — اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

شبلی کی طرح شاید ہمارے مولانا بھی آوارۂ حقیقت مسلمانوں کی جارحانہ کارزاریوں کو اسلام کی صداقت کا سب سے بڑا نشان سمجھتے ہیں، آہ! انھیں خبر نہیں کہ رسول اللہ کی حریت اور مساوات سے بھرپور تعلیم کے گلے پر خود اُن کے پیروؤں نے چھری چلادی "الفقر فخری" جس کا طغرائے امتیاز ہو اُسکی جانشینی کا دعوے کرنے والے اپنے آپ کو غنی (سرمایہ دار) کہلائیں، جو ساری عمر ایک خس پوش مکان میں زندگی بسر کرے اُسکے پیروؤں اُسکے بعد بیس سال کے اندر ہی اندر "قصرِ احمر" اور "قصرِ ابیض" کی بنیادیں ڈالیں، وہ خدا کا برگزیدہ نبی اپنی زندگی میں خود فرمایا کرتا تھا:-

"مسلمانو! اُس دن تمھارا کیا حال ہوگا جب تم روم وایران کی سلطنتوں کو فتح کروگے"

روم وایران کی زبردست تہذیب جب مسلمانوں کے تمدن سے ٹکرائی تو گو ظاہری اعتبار سے فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی مگر غور سے دیکھو تو خود مسلمان اُس قدیم تہذیب کے غلام بن گئے، اسلام کے سیدھے سادھے اُصول "فلسفۂ یونان" کے پیچ در پیچ منطقی دلائل پر ڈھالے جانے لگے، انبیاء اور مرسلین کی سادہ زندگیاں طالمود اور پارسی فسانوں کا نمونہ بن گئیں، اسلام کے مشہور ومعروف سیاست داں امیر معاویہ اور رسول اللہ کے مقدس شاگرد ابو ذر غفاری کے وہ مکالمے پڑھیے جو ان دونوں کے درمیان زمین شام

پر ہوئے، امیر معاویہ مال و دولت پر جان دیتے تھے، دشمن کو ہر طریقے ذلیل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے، مساوات کے اصول کو چھوڑ کر مالِ غنیمت اپنے آوردوں میں تقسیم کر دیتے تھے' ابوذر غفاری نے رسول اللہ کی آنکھیں دیکھی تھیں وہ بگڑے اور کئی دفعہ انھوں نے بھرے مجمع میں امیر معاویہ کو آڑے ہاتھوں لیا' امیر معاویہ نے سلطانِ وقت کے دربار میں شکایت کی اور سرمایہ پرست حکومت نے وہ فیصلہ دیا جو تا قیامت مسلمانوں کو خون کے آنسو رلائے گا' معاویہ شام میں جہاں بانی اور ملک گیری کے لیے گئے تھے اور رسول اللہ کا یہ پیارا شاگرد اصولِ اسلام پھیلانے کا خواہاں تھا' بس "فلسفۂ آلِ محمد" اور "اموی ڈپلومیسی" میں یہی فرق ہے ؎

شب بہ شبستانِ عالم چیدہ است   مصلحت تزویر را نامیدہ است

مملکت را دینِ او معبود ساخت   فکرِ او مذموم را محمود ساخت

اسلام دُنیا میں قومیت، وطنیت اور رنگ روپ کے امتیازات کو دور کرنے کے لیے آیا تھا' وہ "وحدتِ انسانیت" کا زبردست حامی تھا، مگر نام نہاد مسلمانوں نے اسلام کی اصلی اسپرٹ کو بالائے طاق رکھ کر "ہاتھ باندھنے اور ہاتھ کھولنے" "آمین بالجہر اور آمین بالخفا" کا نام مذہب رکھ لیا اور آج ہماری تمام توجہ انہی فروعی مسائل کی طرف مبذول ہے۔ جب تک ہمارے ہاتھ میں تلوار رہی ہمارا وجود دُنیا کے لیے خطرہ بنا رہا

ہم نے اردگرد کے آزاد ممالک کو آرام کی نیند سونے نہ دیا، آج ایران پر چڑھے، کل رُوم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، جب تلوار ہاتھ سے چھن گئی تو اب خانہ جنگی کا بازار گرم ہے، یہ نتائج اُس غلط پالیسی سے پیدا ہوتے ہیں جو بعد وفاتِ رسُول اختیار کی گئی تھی۔

حضرت علیؑ کا نظریہ یہ تھا کہ تلوار کے دھنی عرب جو ہمیشہ لڑنے اور مرنے کو تیار رہتے ہیں چند دن "امن و آرام" کی زندگی بسر کر کے اپنی اندرونی تنظیم کا کام کریں، اپنی اخلاقی اور تمدنی حالات کی اصلاح میں مشغول ہوں اور خدا کے آخری پیغام کو دُنیا کے کونوں تک پہونچائیں، اگر اس نظریے کو قبول کر لیا جاتا تو آج تمام دُنیا مسلمان ہوتی، مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں اسلام کی باگ ڈور تھی وہ سکندرِ اعظم[1] بننا چاہتے تھے اور سیزرِ ثانی[2] کہلانے کے خواہش مند تھے، اُنھوں نے جاہل عربوں کے سیلاب کا رُخ ہمسایہ ملکوں کی طرف موڑ دیا، شہر ویران ہوئے، سلطنتیں تاراج ہو گئیں، اونٹنیوں کا دودھ پینے والے عرب صاحبِ تخت و تاج بن گئے، یہ سب کچھ ہوا مگر اسلام کی سادگی سیاست کے دیوتا پر قربان ہو کر رہ گئی۔

عرب جن کی اصلاح مقدم تھی آج بھی جاہل ہیں، اُن کو تہذیب و تمدن کی

---

[1] سکندر بن فیلقوس وہ یونانی بادشاہ جس نے ایشیا کا بڑا حصہ فتح کر لیا تھا۔

[2] سیزر (CAESAR) روم کا مشہور فرماں روا جس نے یورپ اور افریقہ میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی تھیں۔

ہوا بھی نہیں لگی وہ حاجیوں کو لوٹ کر خوش ہوتے ہیں اور انسان کُشی کو دلچسپ مشغلہ
سمجھتے ہیں، اور عجمہ "علمِ ہمہ دانی" بلند کیے ہوئے ہیں، مگر ان کی حالت یہ ہے کہ
قرآن کو انھوں نے لفظوں کی ایک بھول بھلیاں بنا رکھا ہے۔ محاوراتِ حجاز
سے اُن کو مس نہیں، ہاں بغل میں موٹی موٹی کتابیں دبی ہوئی ہیں، سر پر لمبے
دبیچے عمامے ہیں، کوئی شلوار پہنے ہوئے ہے، کسی کے پاس ڈھیلا ڈھالا
جامہ ہے، کسی کا سر گھُٹا ہوا ہے، کوئی گز گز بھر کے بال رکھے ہوئے ہے
ب کو یہ دعوے ہے کہ ہم قرآن شریف کے معنی اور مطلب کو سمجھنے والے ہیں،
لغتوں کی ورق گردانی ہوتی ہے اور ایک ایک لفظ کے بیس بیس معنی بیان
کیے جاتے ہیں، بریلویوں کی تفسیر جُدا، دیو بندیوں کے معنی جُدا، اور
دیوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اگر کہیں کسی نجدی سے پالا پڑ جائے
اُن کے نزدیک تو لوٹ مار کے سوا ساری باتیں شرک ہیں، مولانا
رالکلام سے دریافت کیجیے تو وہ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کا ایک ایک
لفظ فرنگیوں کے خلاف ایک زبردست اعلان ہے، مولوی ثناء اللہ سے
پوچھیے تو کہتے ہیں کہ ساری آیتیں بدعتیوں اور رافضیوں کو جہنم کا راستہ
دکھا رہی ہیں، مرزائی ہیں کہ اُن کے نزدیک قرآن مرزا صاحب کے منکروں
کے لیے "ابدی عذاب" کا پاسپورٹ ہے، ایک قرآن ہے اور سیکڑوں فرقے
ہر شخص کی اپنی جُدا تفسیر جُدا ترجمہ۔

یہ حالت کیوں پیدا ہوئی ؟ اس لیے کہ محدود عقل والے عرب آج سے تیرہ سو برس پہلے کے زمانے میں روحانیت کے اصلی مفہوم کو سمجھ نہیں سکے، رسول اللہ انسانی فطرت کی کمزوری سے ناواقف نہ تھے، انھیں معلوم تھا کہ میری زندگی کے چند سال مسلمانوں کو اسلام کا اصلی مفہوم سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہیں، میں تو صرف تبلیغِ احکام کیے جاتا ہوں، ان کی تشریح کے لیئے ایک نہ ایک ہستی کی مدت تک ضرورت رہے گی، انھوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَاِنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ؎ کم و بیش تین سو برس تک رسول اللہ کے سچے جانشین قرآن کی تشریح و تفسیر کا مقدس فرض ادا کرتے رہے اور مسلمانوں میں "اصلی تعلیم" کے جو کچھ نمونے آج نظر آرہے ہیں یہ انھیں بلند مرتبہ ہستیوں کا طفیل ہے، اگر وہ تفسیری نوٹ جو حضرتِ علیؑ نے تیار کیئے تھے قبول کرلیئے جاتے تو باہمدگر اسقدر اختلاف نہ ہوتا۔ اہلبیتؑ کا دامن چھوڑ کر مسلمانوں نے وہ زبردست غلطی کی جس کا خمیازہ آجتک تمام دنیا برداشت کر رہی ہے۔ اگر اصلی اسلام کی شعاعیں ممالکِ فرنگ کو منور کرچکی ہوتیں تو یورپ کی موجودہ

؎ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری اولاد، اگر ان سے متمسک رہے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے، اور یہ دونوں اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہونچ جائیں۔

مادہ پرستی اور سرمایہ داری وجود میں نہ آتی ۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔" مولانا نے ایک ایسی فضا میں پرورش پائی ہے جہاں اسلام کی مادی تحریکوں کو معراجِ کمال سمجھا جاتا ہے، انھوں نے آنکھیں کھولتے ہی نپولین بوناپارٹ اور اگسٹس کے فسانے پڑھے ہیں اور وہ اسلام کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک عیاش سلاطین کی ہر جنگ ایک کربلا تھی، اور حریص لٹیروں کا ہر حملہ مقدس جہاد ہے، شبلی خود تو مر گئے مگر انگریزی داں طبقے کے سامنے اسلام کی وہ بھیانک تصویر چھوڑ گئے جس کو دیکھ کر ہر روحانیت پسند" شرم سے مر مر جاتا ہے۔ وہ اپنی مشہور کتاب الفاروق میں اپنے ہیرو کی اس طرح تعریف کرتے ہیں :۔

"انھوں نے تنخواہ دار فوج رکھنے کا طریقہ نکالا، انھوں نے چند سال کے عرصے میں سکندر اعظم سے بڑھ کر فتوحات حاصل کرلیں۔"

یہ ہے وہ عسکریت اور شہنشاہیت جس نے اسلام کو دُنیا میں قسمت آزماؤں کا منصوبہ" بنادیا، وہ اسلام جس کو شبلی اور اُن کے متبعین دُنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں پنڈاریوں اور لٹیروں کی" ٹھگ ودیا" سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا، حقیقی اسلام دیکھنا ہو تو آلِ محمدؐ کی سیرت کا مطالعہ فرمائیے، علیؑ کی وہ تلوار جو اسلام کی مدافعانہ جنگوں میں بجلی کی طرح چمکتی رہی گردوپیش کے ممالک کی آزادی سلب کرنے کی خدمت ادا کرنے سے قاصر رہی

وہ بہادر جس نے اسلام کی حفاظت کے لیے عرب کے بڑے بڑے سورماؤں کو ناک چنے چبا دیے، تسخیرِ ممالک سے ہمیشہ باز رہا، وہ لوگ جنھوں نے مال و دولت کی خاطر دُنیا کی آزاد قوموں کو غلام بنانے کا منحوس کام انجام دیا اسلام کی تعلیم سے کوسوں دُور تھے، وہ سکندرِ اعظم اور چنگیز خاں کے مقلد تھے: اُنھیں پیغمبرِ اسلام کے اُسوۂ حسنہ کوئی سروکار نہ تھا، بڑی بڑی تنخواہیں لے کر قومی کام کرنا اور صرف ہر دلعزیزی کے لیے "سیواجی[1] کی تقلید" کا دم بھرنا آسان ہے مگر جان پر کھیل کر بہتر کی قربانی چڑھا کر اسلام کو ذلت و خواری سے بچا لینا مشکل ہے۔

ازبس کہ کربلا میں امام حسینؑ کی زبردست قربانی دُنیا میں اپنی آپ ہی نظیر تھی اس لیے مولانا محمد علی کا یہ شعر ترمیم کا محتاج ہے ؎

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

---

[1] اسی زمانے میں سیواجی کی برسی کے ایک جلسے میں مولانا صاحب یہ کہہ چکے تھے کہ سیواجی کا عمل قابلِ تقلید ہے۔

اسلام محدثِ انسانیت کا زبردست حامی ہے

آج سے دو برس پہلے کا ذکر ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے دسمبر کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی، شام کے چار ساڑھے چار بجے تھے، میں دن بھر کا تھکا ماندہ تو تھا ہی، دل میں خیال آیا کہ چلو جھوٹی مارکٹ کی سیر کر آؤں، "جھوٹی مارکٹ" کراچی کے مرکزی بازار کا نام ہے۔ یوں تو یہاں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے؛ (وہ مزدور جو دن بھر کارخانوں، بندرگاہوں اور دکانوں پر کام کرتے ہیں شام کو یہاں آکر دل بہلاتے ہیں) مگر آج خلافِ معمول ذرا زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی، بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کا ایک دریا ہے جو موجیں مار رہا ہے پھر آدمی بھی رنگ برنگ کے کوئی کالا کوئی گورا، کسی کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی، کوئی سُرخ و سفید، کسی کے سر پہ لال ٹوپی تھی، کوئی سبز پگڑی باندھے ہوئے تھا

بہت سے مغربی تہذیب پر جان دینے والے ننگے سر چلے جارہے تھے، میں تھوڑی دیر تک تو اس نظارے کو معمولی طرح دیکھتا رہا، پھر یکایک دل میں ایک خیال پیدا ہوا، کیا "یہ دنیا ہمیشہ سے اسی طرح آباد ہے؟" جستجو پسند طبیعت خدا جانے کہاں سے کہاں لے گئی، میں کھڑا تو تھا بازار کے چوک میں، مگر طائرِ خیال کسی اور عالم کی سیر میں مشغول تھا۔ میں نے ایک مرتبہ دماغ پر زور ڈالا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کہہ رہا ہے:۔ هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، وہ اندھیرا جس نے ابھی تک روشنی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی، یہ بزمِ عالم خاموش تھی، کائنات کا ذرہ ذرہ آغوشِ عدم میں محوِ خواب تھا کہ یکایک زمین کا خاکی فرش بچھایا گیا، آسمان کا نیلگوں شامیانہ تانا گیا، اور اس میں آفتاب و ماہتاب کی قندیلیں اور ستاروں کے قمقمے آویزاں کیے گئے، خدا جانے کس کی آمد کا سامان تھا۔ مدتیں گزر گئیں آفتاب نے اپنے محور پر سیکڑوں چکر لگا لیے، چاند نکلا بڑھ کر بدرِ کامل بنا اور گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو گیا (حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ) خوبصورت آنکھوں والے ہرن کلیلیں کرتے پھرتے تھے، آبشاروں کا شفاف پانی شب و روز نغمہ خوانی میں مشغول تھا، جا بجا خودرَو پھول کھلے ہوئے تھے، جن کے آس پاس بلبلِ ہزار داستاں اپنا غمناک راگ

الاپا کرتی تھی، سرو بھی موجود تھا اور قمری بھی، موسم بہار بھی تھا اور خزاں بھی، غرض سب کچھ تھا مگر محفلِ عالم سنسان سی معلوم ہوتی تھی، کہ یکایک کسی کی ایجاد پسند طبیعت نے ایک دوسری کروٹ لی، سنا کر ایک آواز پیدا ہوئی (اذ قال ربك للملئكه) اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

مٹھی بھر خاک کے پتلے کو یہ شرف ملا کہ ساری دنیا اسکے سامنے جھک گئی اور جو نہ جھکا وہ نکال دیا گیا، غور سے دیکھو یہ سجدہ نہ تھا بلکہ اس بات کا اعلان تھا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ انسان کا تابع ہے دنیا کی ہر اک چیز اسی کے آرام و آسائش کے لیے پیدا کی گئی ہے لولاك لما خلقت الافلاك ہونے کو تو ساری دنیا موجود تھی، مگر رازِ قدرت انسان کے کان میں پھونکا گیا اور اس نے خوشی خوشی سب کچھ قبول کر لیا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

وہ انسان جو آج تخت و تاج کے مالک بن کر کوس لمن الملک بجا رہے ہیں وہ خود غرض اور طامع لوگ جو بنی آدم کا گلا گھونٹ دینے کو تیار ہیں، وہ رنگیلے نوجوان جو ٹیڑھی ٹوپی پہن کر نکلتے ہیں، ایک دن کچھ بھی نہ تھے، قدرت ان کو عدم سے وجود میں لائی تا کہ محفلِ عالم میں رونق ہو، اور بزمِ

آراستہ کی جائے، مگر یاد رکھو جو ہاتھ بنا سکتا ہے وہ بگاڑ بھی سکتا ہے، وہ دن دُور نہیں ہے جب یہ جمی جمائی مجلس منتشر ہو جائے گی، فرش طے کر دیا جائیگا، شامیانہ اُتار دیا جائے گا، اور یہ قدرتی فانوس گُل ہو جائینگے

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ... الخ اذا السَّماء

منطق! بات سے بات پیدا ہوتی ہے اور ایک خیال دوسرے خیال کی طرف رہنمائی کرتا ہے، مجھے بازار میں کھڑے کھڑے پورا آدھ گھنٹہ ہو گیا تھا، اور خدا جانے کتنی گاڑیاں، کتنے گھوڑے اور کسقدر انسان میرے سامنے سے گزر چکے تھے، سردی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی کم پڑتی جاتی تھی، میں نے بھی خیالی دُنیا سے نکل کر گھر کی طرف چلنے کی ٹھانی، ابھی دو چار ہی قدم آگے بڑھا ہونگا کہ ایک دوسرے خیال نے دماغ میں ڈیرے ڈال دئے۔

انسان ہے کیا، اور دُنیا میں اِسے کیا کرنا چاہیئے؟ " اس مرتبہ میا دل کی طرف مخاطب ہوا، وہ دل جو مدتوں سے حسرت و یاس کا ایک عالم پہلو میں لیئے ہوئے ہے، جس کے دامن میں ایک دُنیائے آرزو بستی ہے جو جذبات کا ایک لبریز جام بنا ہوا ہے، جس کی تڑپ راتوں کو نیند اور دنوں کا آرام اُڑا دیتی ہے، جو ہے تو ایک گوشت کا لوتھڑا، مگر پتھر سے زیادہ سخت، "چھوئی موئی" سے زیادہ ذکی الحس، ایسا معلوم ہوا کہ

گویا کوئی دل کے اندر پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ انسان قدرتِ کاملہ کا بہترین نمونہ ہے، یہ وہ مخلوق ہے جس سے خالق کا نور ٹپکتا ہے، وہ نقطہ ہے جو دائرے کا ہمدوش ہے، وہ جزو ہے جس میں کل سمایا ہوا ہے، صناع کامل کی آخری صنعت نقاشِ ازل کا سب سے بڑا نقش: مصورِ حقیقی کی وہ تصویر جسے اس نے اپنی صورت پر بنایا، اور رنگ روپ بھر کر اس کی تکمیل کی، نہ مٹنے والا نشان، نہ فنا ہونے والی ہستی یاابن آدم خلقتك للبقاء، لا للفناء

یہ راز دانِ حقیقت دنیا میں اس لیئے نہیں آیا کہ کھائے پیئے اور مر جائے اس کشمکش گاہِ عالم میں ہر چیز پیشِ نظر ایک مقصد ہے، ساون کی گھنگھور گھٹائیں جو آفتابِ عالمتاب کو اپنے دامن میں چھپائے لیتی ہیں، جیٹھ بیاکھ کی جلا دینے والی ہوائیں جو سارے جہان کو دوزخ ارضی بنا دیتی ہیں، ماگھ پوس کی لرزش خیز سردی، جون جولائی کی قیامت آفریں گرمی عالم وجود میں نہ آئے تو اہلِ دنیا کی زندگی دوبھر ہو جائے، نہ غلہ بویا جائے، نہ فصلیں پیدا ہوں، نہ میوے کھانے کو ملیں، نہ پانی میسر آئے، جب دنیا کی ہر چیز کا ایک مقصد ہے تو یہ آدم کے بچے آخر کس مرض کی دوا ہیں اور ان کی خلقت میں کونسا راز پوشیدہ ہے چلو اس راز کو دیوبند کے فارغ التحصیل طلباء سے دریافت کریں جو ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور گھٹنوں سے نیچا کرتہ پہنتے ہیں یا لکھنؤ کے ان مقدس علما سے پوچھیں جن کی تسبیح کے دانوں نے گردش زمین سے شرط بد رکھی ہے جنکی

پیشانیاں سجدہ ریزی کی شاہد، جن کی آنکھیں شب خیزی کی گواہ، جنکی رفتار وگفتار سے خدادانی تراوش کرتی ہے، نہیں نہیں یہ راز ان ہیئت پرشول کے سامنے پیش کریں جن کی آنکھیں جھپنے ہی سے وقف حیثمہ ہو کر رہ جاتی ہیں، جن کے چہروں کی صفائی ان کے تصفیہ قلب پر دلالت کرتی ہے۔

دُور کیوں جائیں یہ راز عالم آشکارا ہے، انسان دُنیا میں اس لئے پیدا ہوا ہے کہ خود آزاد زندگی بسر کرے اور دوسروں کو آزاد رہنے میں مدد دے اور معبود حقیقی کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکائے، خواہ وہ پتھر کا بت ہو یا چلتا پھرتا انسان ...... اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰہِ الخ اس جہانِ فانی کی ہر چیز اپنے عمل میں آزاد ہے، شاخِ گل پر چہکنے والی بلبل، طوافِ سرو میں مشغول قمری، دریا کی مضطرب موجیں، چٹانوں سے ٹکرا کر نغمہ سنجی کرنے والے چشمے یہاں تک کہ وہ رنگ برنگ کے خزف ریزے جو ساحلِ بحر کی زینت بڑھاتے ہیں سب کے سب ایک خالق حقیقی کے سوا دُنیا میں کسی کے منت پذیر نہیں، پھر یہ انسان آپس میں ایک دوسرے کی غلامی کا طوق گلے میں کیوں ڈالے ہوئے ہیں وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ہم سب کے سب ایک قادر اور توانا ذات کی عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور بس۔

انسان بلا کا حریص ہے، وہ اپنے عارضی سرور کے لیئے دوسروں کو اپنا غلام بناتا ہے، ساری دُنیا میں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس کے باغوں میں خوبصورت پرندے، بھانت بھانت کے جانور اسکی نظر افروزی کے سامان بہم پہونچانے کے لیئے قید رکھے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس کی یہ حرص اس قدر ترقی پذیر ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں کا بھی آقا بن بیٹھتا ہے اور رنگ روپ، وطنیت وقومیت کے امتیازات قائم کر کے ایک ملک کے ملک کو زندان بنا دیتا ہے۔

اسلام سب سے پہلا مذہب تھا جس نے نہایت نے وردار لفظوں میں انسان پرستی، وطن پرستی اور قوم پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی

"سب انسان آپس میں برابر ہیں، ساری دُنیا ہمارا وطن ہے اور آدم کے سب فرزند ایک ہی قوم ہیں۔"

یہ وہ بلند نظریہ ہے جس پر اسلام کی عالمگیر اخوت کی بنیاد رکھی گئی، ترک ہوں یا ایرانی، عرب ہوں یا عجم، جب تک وہ مسلمان ہیں ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے کیونکہ انما المومنون اخوۃ کی زنجیریں ان کو آپس میں جکڑے ہوئے ہیں۔

"توحید" جس پر مسلمانوں کو ناز ہے "ایک خدا اور ایک اُمّت" کا مفہوم اپنے دامن میں لیئے ہوئے ہے، اور جس دن ہم نے اپنے اس زریں نظریہ

کو فراموش کر دیا اسی دن ہماری گردنیں بتوں کے سامنے جھک گئیں،
چودھویں صدی کے مسلمان لاکھ باتیں بنائیں کہ ہم توحید پرست ہیں لیکن
درحقیقت اس سے کوسوں دور ہیں، ہم نمازوں میں تو ایاک نعبد
و ایاک نستعین کہتے ہیں مگر ہماری پیشانیاں امرا و رؤسا کے
آستانوں پر جھکی پڑی ہیں، ہم عزت و آبرو کو خدا کے بجائے اہل اقتدار
کے دروازے پر ڈھونڈھتے ہیں، اور اس شرکِ خفی میں اَن پڑھ ہو یا
پڑھا لکھا، امیر ہو یا غریب سب مبتلا ہیں، اور سچ پوچھیے تو پڑھے لکھے جاہلوں
سے بدتر ہیں، بیچارہ جاہل آج بھی "آزادی اور حمیت" پر مرتا ہے
مگر یہ پڑھے لکھے منتیں مان مان کر غلام بنتے ہیں، اُس بُلبُل کے حال پر
وائے ہو جو خود ہی صیاد کے دامن میں جا بیٹھے، اُس مرغ کا خدا ہی
حافظ ہے جو گربۂ مسکین کے پاس امن کا متلاشی ہو، یہ ہماری غلامانہ ذہنیت
کا اثر ہے کہ آج ہماری تمام خوبیاں ہم سے دور ہو گئی ہیں۔
ہم لڑتے ہیں مگر گھر والوں سے، وعظ[1] کرتے ہیں مگر نفاق انگیز، شر خیز،

---

[1] جو لوگ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ مذہب امامیہ کی ترویج و ترقی زیادہ تر مجالس عزا کی رہین منت ہے، ان مجلسوں کے ذریعہ سے ایک طرف تو ہم نے تبلیغ دین کی اور دوسری طرف تحفظ قت کا اہم فرض انجام دیا، محمد و آل محمد کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر اگر ایک طرف سننے والوں کو ہمارے دین کی طرف مائل کرتا ہے تو دوسری طرف ہمارے اندر اخلاق حسنہ کی طرف رغبت کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے، مجالس عزا کی تاریخ بہت دلچسپ ہے، کربلا کے روح فرسا واقعہ کے بعد اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے محبان آل رسول کسی مقام پر جمع ہو کر ان مصائب کا ذکر کیا کرتے تھے جو بنی اُمیہ کے ہاتھوں اولاد رسول پر پڑے ..... (بقیہ آئندہ صفحہ پر)...

ہماری تلواریں ہماری گردنوں پر پڑتی ہیں اور ہمارے مواعظ خود ہماری ہی طاقت

(بقیہ صفحہ گزشتہ) .... ازبسکہ اس قسم کے مجمعے اور ذکر و اذکار اُس وقت کی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرتے تھے، اس لئے حکومت نے ان پر بندش عائد کی اور تشدد ہی سے کوشش کی کہ مجالس عزائے حسینؑ برپا نہ ہوں، مگر

الانسان حریص علی ما منع — "انسان کو جس چیز سے روکئے اس کا اُسے اور شوق ہو جاتا ہے۔"

جس قدر مخالفت بڑھی اسی قدر مجالس زیادہ برپا ہوئیں، حکومت نے اپنے تمام ذرائع اس تحریک کو بند کرنے کے لیے صرف کیے، جا بجا جاسوس مقرر تھے جو طرفداران آلِ محمدؐ کا پتہ لگاتے تھے اور آئے دن کوئی زنداں میں بند کیا جاتا تھا اور کوئی دار پر چڑھایا جاتا تھا، اس طرح مجالس عزا نے شیعوں میں وحدتِ مقصد اور وحدتِ عمل پیدا کی، اور اس وحدت سے ایک ایسی جماعت عالم وجود میں آئی جس نے آلِ محمدؐ کے کارنامے سُن سُن کر ظلم و ستم سے نفرت اور عدل و انصاف سے محبت کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ شروع شروع میں مجالس کے اندر نظم و نثر کے ذریعہ سے آلِ محمدؐ کے فضائل و مصائب بیان کیے جاتے تھے جب حکامِ وقت نے ان اجتماعات پر پابندی عائد کر دی تو لازمی طور پر خلاف قانون جمع ہونے والوں نے مجلس کے قبل یا بعد حکومت کی حکمتِ عملی پر اظہار خیال کرنا شروع کیا ہوگا۔ عباسیوں کے آخری دور میں جب خلیفۂ بغداد تقریباً معطل تھا، اور عنانِ اقتدار آلِ بویہ کے ہاتھ میں تھی علانیہ عزاداری ہونے لگی، تو مجالس کا معیار بھی بڑھا اور مصائب اور فضائل کے ساتھ ساتھ تبلیغی پہلو بھی اس میں داخل ہونے لگا، لیکن نہ اسقدر کہ اصل غرض پر حاوی ہو جائے اور نہ اس طرح کہ مختلف عقائد رکھنے والوں کو ناگوار ہو، جب آہستہ آہستہ ایران شیعیت کا مرکز بنا اور صفویوں نے عروج پایا تو انھوں نے تنظیمی اور تبلیغی دونوں قسم کے فوائد اس سے حاصل کیے، بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب شیعہ تھے، اور دل کھول کر عزائے حسینؑ میں حصہ لیتے تھے، کثرت سے مجلسیں ہوتی تھیں، اور انہی کا یہ اثر تھا کہ ایران اور اُس کے پاس کے ممالک میں محبانِ آلِ محمدؐ کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی، جب تیمور کی اولاد ہندوستان میں آئی اور محبتِ اہلبیتؑ کے علانیہ اظہار پر کوئی قدغن نہ رہا تو ہندوستان میں بھی مجلسیں شروع ہوئیں اور "روضہ خوانی" کے طریقے پر ذکرِ حسینؑ ہوتا رہا۔ "روضۃ الشہداء" فضائل و مصائب اہلبیت کی ایک کتاب ہے، جس کو سلطان حسین ہروی کے حکم سے ملا حسین واعظ کاشفی نے جو اس کے دربار کا رکن تھا مرتب کیا تھا، اس کتاب کا ترجمہ ہر ایشیائی زبان میں ہو چکا ہے اور بلادِ ایشیا میں ہر جگہ یہ دلچسپ مجموعہ مجالس میں پڑھا جاتا ہے، اودھ میں جب شیعہ حکومت قائم ہوئی تو شیعیت کے ساتھ ساتھ یہاں بھی مجالس عزا کا سلسلہ شروع ہوا اور نثر و نظم کے ذریعہ سے مصائبِ اہلبیتؑ بیان ہونے لگے، آہستہ آہستہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا دور شروع ہوا اور حق یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مجالس مقبولِ عام ہو گئیں، ہندو مسلمان سب ان مجالس میں شریک ہوتے تھے اور شعراء کے کلام سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ آلِ محمدؐ کے کارناموں سے بھی واقفیت حاصل کرتے تھے، کچھ اودھ ہی پر منحصر نہیں ہے، ایرانی لوگ جہاں جہاں گئے وہاں مجالس کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش کی، دکن، سندھ، ملتان اور پنجاب کے علاقوں میں یہ سلسلہ عرصۂ دراز سے جاری ہے .... (بقیہ آئندہ صفحہ پر) ....

کو برباد کر رہے ہیں، ہمارا کام یا ذاتی اغراض پر مبنی ہوگا یا دوسرے کے
نقصان پر، وہ ہمت و جرأت جو کبھی صرف خدمتِ اسلام ہوتی تھی آج
مجلسوں کی شیرمالوں پر کام میں لائی جاتی ہے، اور وہ مواعظ جو ملت خوابیدہ کو

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ...... ہندوستان میں تیموریوں کی حکومت کی وجہ سے مجالس عزا صرف شیعوں تک محدود نہیں رہیں بلکہ سُنّیوں نے بھی اس میں بیش از بیش حصہ لیا، اور یہ اجتماعات دو اسلامی فرقوں کے اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بن گئے۔ مگر انگریزی دور کے آغاز اور مغلیہ حکومت کے اختتام کے زمانے سے باہمی جنگِ عقائد اور مناظرہ بازی نے آہستہ آہستہ اس اتحاد کو پاش پاش کر دیا۔ راقم الحروف کے نزدیک مسلمانوں کو ملانے کے لیے مجالس عزا بہترین ذریعہ ہیں، اگر واعظین و ذاکرین اختلافی مسائل کو ذرا احتیاط سے بیان کریں تو ہر اسلامی فرقہ ان میں شریک ہو کر فائدہ اٹھا سکتا ہے
ابتدا میں مجالس عزا کی حالت جو کچھ بھی ہو اب تو وہ ایک زبردست انسٹی ٹیوشن بن گئی ہیں اور ان کے ذریعے تنظیم و تبلیغ کے بہت سے اہم کام لیے جا سکتے ہیں، راقم الحروف کا خیال تو یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے امام حسین علیہ السلام کی ذات عالمگیر حیثیت اختیار کرتی جاتی ہے، اُنکا نام حمایتِ انسانیت اور مخالفتِ ظلم و ستم کا مظہر بن گیا ہو، اور دنیا کی ہر قوم ان کے بلند اغراض و مقاصد سے عقیدت رکھتی ہو، اسلیے ضرورت اس بات کی ہو کہ اس دورِ مادہ پرستی میں حسینؑ کی سیرت تمام دُنیا کے سامنے پیش کی جائے اور اُن کا پیام امن اقوامِ عالم کو سنایا جائے اور اس طرح مجالس عزا کو ایک بین الاقوامی انسٹی ٹیوشن بنا دیا جائے، خدا کرے کہ ہمارے ذاکرین اس نکتہ پر غور کر کے، رفتارِ زمانہ کے موافق ان مجالس کی افادیت میں اضافہ کر سکیں، ہر تنزل پذیر قوم تغیر کی منکر بنی رہتی ہے اور یہی حال ہمارا بھی ہے، ہم اپنی سہل انگاری کی وجہ سے اپنے موجودہ طرزِ ذاکری میں تبدیلی کرنا پسند نہیں کرتے، حالانکہ تاریخ بتا رہی ہے کہ دُنیا کی ہر چیز کی طرح ذاکری بھی ارتقائی منزلوں سے گزر رہی ہے، آج جو طرز جاری ہے وہ ہمیشہ سے ایسا ہی نہیں چلا آرہا ہے، ذرا "دہ مجلس" اور "ذوالفقار ماتم" پر نظر ڈالیے، اور پھر آج کل کے کسی معیاری ذاکر کا بیان سنیے تو زمین و آسمان کے فرق نظر آئیں گے.
دوستو! ہر دور کے لوگوں نے اپنی ترقیوں کو انتہائی سمجھا ہو اور اس لیے اگر ہم اپنے طرز ذاکری کو معیاری سمجھ رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہو، مگر جس طرح میر و سودا کے زمانے کے مرثیے آج صرف تبرک ہو کر رہ گئے ہیں، جس طرح "دہ مجلس" کی روایتیں اب لوگ صرف "بنظرِ ثواب" سُن لیتے ہیں اسی طرح اس ذاکری کا بھی "دمِ واپسیں" قریب ہے، تعلیم تیزی کے ساتھ عام ہو رہی ہے، اور کائنات اور موجودات کے متعلق لوگوں کے نظریے سرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں، اب لوگوں کو اتنی عقل آچکی ہو کہ وہ افسانہ و حقیقت اور منطقی استدلال اور لفاظی میں فرق کر سکیں، قبل اسکے کہ تعلیم یافتہ جماعت علمِ بغاوت بلند کرے یا مجالسِ عزا سے پڑھے لکھوں کی دلچسپی کم ہو جائے ہم کو ان کی اصلاح کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

جگا دیا کرتے تھے آج رُوسار کے لیئے "داستانِ شب" بنا دیئے گئے ہیں۔ جس قوم نے "حسینؑ کی شہادت" کا حیرت انگیز اور ولولہ افزا بیان تیرہ سو سال تک سُنا ہو، جس کی رگوں میں وہی خون ہو جو کربلا کی زمین پر بہایا گیا تھا آج وہ اغیار کی دست نگر، اپنوں کی غلام، اور "نقصانِ مایۂ و شماتتِ ہمسایہ" کی مصداق بنی ہوئی ہے۔

ہم نے اپنے اسلاف کے اخلاقِ فاضلہ کو بھلا دیا، محمدؐ و آلِ محمدؐ کے اُسوۂ حسنہ کو پسِ پشت ڈال دیا، اور سچ تو یہ ہے کہ واحد خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی تقلید میں جھوٹے خداؤں کی پرستش کرنے لگے، اگر مجھے اپنے چند دوستوں کے ناراض ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں سچ سچ کہہ دیتا کہ قوم کی موجودہ بد مذاقی کی ذمہ داری واعظین اور مقررین کے سروں پر ہے، اگر آج ہی ہمارے مواعظ کا رنگ بدل جائے تو دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ وہ قوم جسکے "نالۂ نیم شبی" نے "بنی اُمیہ کو خاک میں ملا دیا، جسکی شرارہ افشانیوں نے عباسیوں کا تخت اُلٹ دیا آج بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ حجازؑ کی درد بھری داستان اور سرحد کے ہولناک واقعات چشمِ عبرت کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

ﻠﮧ فتنۂ نجد اور جنگِ تیراہ کی طرف اشارہ ہے، تیراہ سرحد پر ایک زرخیز علاقے کا نام ہے، اس زمانے میں وہاں مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے۔

رُوحانیت کا بھولا ہوا سبق

جاہل عربوں کو حریت اور مساوات کی تعلیم کس طرح ملی

رات بہت جا چکی تھی، کوفہ میں چاروں طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا، شہر کے وہ مقامات جہاں دن کو کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی اس وقت بالکل سنسان پڑے تھے، دن بھر کے تھکے ماندے مزدور جو جوار کی روٹی کھا پی کر کبھی کے لمبی تان چکے تھے، بازار کی دکانیں ایک ایک کر کے سب بند ہو چکی تھیں، رات تھی اندھیری اور جاڑا کڑاکے کا پڑ رہا تھا، میں تاریک گلیوں اور سنسان کوچوں میں سے گزرتا ہوا دارالامارہ کے قریب پہونچا، خیال تھا کہ شہنشاہِ عرب کے صفے پر نوکروں چاکروں کا ایک ہجوم ہوگا، یہاں آکر دیکھا کہ نہ چوبدار تھا نہ دربان، نہ خدم تھا نہ حشم، ایک خس پوش مکان تھا، جس پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ایک سرے سے دوسرے سرے

تمام ایک خاموشی کا عالم تھا، ہاں اس خاموشی کو توڑنے والی "وہ تسبیح وتہلیل" کی عجز و انکسار سے بھری ہوئی صدا تھی جس کے ہر ہر لفظ سے حجازیت ٹپکتی تھی، میں تھوڑی دیر تو دروازے پر کھڑا رہا کہ شاید کوئی نوکر یا غلام آئے تو اسکے ذریعے سے باریابی حاصل کروں، دُور سے آیا تھا اور امام وقت کی زیارت کا شوق بھی تھا، آخر ہمت کر کے اندر داخل ہو ہی گیا، دیکھا تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور ایک طرف سے تکبیر کی صدا آرہی تھی، میں اس آواز کے سہارے پر قدم بڑھاتا گیا، ایک کونے میں ایک شخص چادر اوڑھے بیٹھا ہوا، سردی کے مارے کانپ رہا تھا، میں نے سلام کیا اور جھک کر غور سے دیکھا تو وہ دین و دُنیا کے سردار جمہوریت عربیہ کے صدر، امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام تھے۔ میں نے دریافت کیا، مولا یہ کیا حال ہے؟ فرمایا۔

"میں مدینے سے یہی چادر لے کر چلا تھا، خدا کی قسم میں نے تمہارے بیت المال سے اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کیا۔"

عید کا دن تھا دُنیائے اسلام کے کونے کونے میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں، سرمایہ دار زرق برق لباس پہنے ہوئے نماز کی تیاری میں مشغول تھے، میں دارالامارہ میں پہونچا کہ چلکر اپنے مولا کو عید کی مبارکباد دوں دیکھا کہ سامنے جو کی روٹیوں کے چند سوکھے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں اور حضرت

ذوق وشوق سے تناول فرماتے جاتے ہیں، اور زبان پر ذکرِ خدا جاری ہے، میں نے کہا کہ "مولا"! آج تو عید کا دن ہے"۔ آپ نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا :-

"عید! ارے عید ان لوگوں کے لیئے ہے جو عذاب آخرت سے امون ہو چکے ہوں، دیکھ! اس دکھ بھری دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہ ٹکڑے بھی میسر نہیں ہوتے؛ آہ! آج سیکڑوں گھر فاقوں سے مرتے ہیں اور ان کی عید رمضان سے کچھ زیادہ بہتر نہیں"۔

کوفہ کی مسجد میں شور ہے کہ آج رسول اللہ کا داماد، عرب کا سب سے بڑا فلسفی، اسلام کا درویش صفت تاجدار اپنا پہلا خطبہ پڑھنے کے لیئے مسجد میں آرہا ہے، مسجد کا چپہ چپہ مسلمانوں سے بھرا پڑا ہے اور سب کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی ہیں، لو وہ ایک کھدر پوش داخل ہوا جس کے سر پر ایک سبز رنگ کا عمامہ ہے، جسم پر ایک کرتہ ہے، جس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے ہیں، وہ صفوں کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے لوگ اس کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں، وہ نرم آواز میں کہتا ہے :-

"ہاں میں ہی علیؑ ہوں، میں تمہیں خطبہ سنانے کے لیے آیا ہوں"۔

استعجاب و حیرت کی نگاہیں تڑپ تڑپ کر اس کے چہرے پر پڑتی ہیں اور قارون صفت اور فرعون خصلت بادشاہوں کا جاہ و جلال دیکھنے والے

لوگ متحیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قیصرِ روم کا سفیر مدینہ آیا ہے، وہ اسلام کے متعلق چند سوالات دریافت کرتا ہے، ایک سخت مقدمہ درپیش ہے، حکومتِ وقت کو تشویش ہے کہ اسے کس طرح طے کیا جائے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ مشکل علیؑ کے سوا دوسرے سے حل نہ ہوگی، حکومت مع اپنے ساز و سامان کے علی کے دروازے پر حاضر ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی یہودی کے باغ میں مزدوری کر رہے ہیں۔

یہ اُس شخص کا حال ہے جو اسلام کا سب سے بڑا روحانی پیشوا تھا، جو ایک وقت میں بحیرۂ روم سے لے کر ایشیائے کوچک تک اور بحرِ قلزم سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک حکمرانی کرتا تھا، جس کے دروازے پر بڑے بڑے تاجدار سر جھکاتے تھے، اور جس کا دربار آج بھی سلاطینِ عالم کی جبینِ نیاز کے لیے سرمایۂ عزت ہے، وہ اسلام کی صحیح تعلیم کا ماہر تھا، اُس نے روحانیت کے اصلی مفہوم کو سمجھا تھا، اُس کا "دورِ حکومت" گرد و پیش کے آزاد ممالک کے لیے خطرہ نہ تھا، وہ امن پسند شہریوں کو مالِ غنیمت کے لالچ میں بے خانماں کرنا گناہ سمجھتا تھا، وہ ان مذہبی ڈاکوؤں اور سیاسی چالبازوں کی طرح نہ تھا جو اسلام کے پردے میں اپنے ذاتی مفاد کا شکار کھیلتے تھے اور سکندر و چنگیز کی طرح امپیریل ازم (شہنشاہیت) پر مرے جاتے تھے۔

اُس نے عربوں کی اندرونی حالت کی اصلاح کی، ان کو تنظیم کا بھولا ہوا سبق پڑھایا، تہذیب تمدن کے راستوں سے آگاہ کیا، وہ مدت العمر تعمیری لائحہ عمل پر زور دیتا رہا، اُس نے صاف کہدیا کہ تخریبی پروگرام قوم کے لیے مفید نہیں، اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس امر سے ناواقف نہیں ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محدود مدتِ حیات عرب جیسی جاہل قوم کی تنظیم کے لیے کافی نہ تھی، ضرورت تھی کہ ابھی چند سال تک عربوں کو امن اور چین کے حقیقی فائدوں سے مستفیض کیا جائے، اور دوسری قوموں کی طرف توجہ مبذول کرنے سے قبل خود عرب کی اندرونی اصلاح کر کے وہاں متحدہ قومیت کی مضبوط بنیاد ڈالی جائے۔ امیر المومنین علیؑ کا نظریہ اگر شروع ہی میں قبول کر لیا جاتا تو اسلام کو آج یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عرب کی اکثریت آج بھی مذہب سے اتنی ہی بیگانہ ہے جتنی وہ رسول اللہ صلعم سے پہلے تھی، حجاز کا سفر کرنے والے اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ بدویوں کے عقائد اسلامی تعلیم سے کسقدر تعلق رکھتے ہیں، اور اُن کے انسانیت سوز حرکات و سکنات دُنیائے اسلام کے لیے کسقدر ندامت کا باعث ہیں عرب اپنے پُرانے عقائد کے بتوں کو پورے طور پر توڑنے بھی نہ پایا تھا، اُسکی مارشل اسپرٹ[1]

---

[1] جنگی ولولہ

(MARTIAL SPIRIT) ابھی محتاجِ تنظیم ہی تھی کہ اسلامی رہنماؤں نے اُس کو ہمسایہ ملکوں پر دھاوا کرنے کا حکم دے دیا۔ رُوم اور ایران کی قدیم تہذیبیں عرب کے نوخیز تمدن سے ٹکرائیں اور گو مادی فتح عربوں کے ہاتھ رہی، مگر غور سے دیکھیے تو عرب اپنی اس سادگی کو ہاتھ سے دے بیٹھے جو برسوں سے ان کا سرمایۂ افتخار تھی، اور جس پر اسلامی اخوت کی بنیادیں رکھی گئیں تھیں۔ سونے اور چاندی کا امتیاز نہ کرنے والے عرب چند ہی سال کے اندر قیصر و کسریٰ کے لیے باعثِ رشک بن گئے، اور اُن کے عالیشان محلات، خدم و حشم، اور کرّ و فر کے سامنے دربارِ روم و شام کی داستانیں فسانہ بن گئیں۔ آہ! رسول اللہ صلعم کی پھٹی ہوئی دستار کے بدلے سلطانِ وقت کے سر پر زریں تاج نظر آنے لگے اور بوریے کی جگہ سونے اور چاندی کے تختوں نے گھیر لی، مسلمان مالامال ہو گئے .... اونٹوں کے چرانے والوں کے ہاتھ میں عنانِ سلطنت آ گئی، لکڑیاں بیچنے والے مالک الرقاب بن گئے؛ یہ سب کچھ ہوا، مگر اسلام کی سادگی رُخصت ہو گئی، روحانیت کا وہ جلیل القدر سبق جو اللہ کے آخری پیغمبر نے دُنیا کو پڑھایا تھا ایک مرتبہ پھر فراموش کر دیا گیا، علیؑ کا طرزِ عمل بالکل جُداگانہ تھا، وہ توسیعِ سلطنت کو ایک فریبِ نظر سمجھتے تھے، وہ مصلح تھے، ریفارمر تھے، انھوں نے اپنی قوم کی اصلاح کو مقدم سمجھا اور تمام عمر وحدتِ انسانیت کا وعظ کرتے رہے۔

مذہب جو تہذیب اور تمدن کا دوسرا نام ہے، مادی طاقتوں سے نہیں پھیلایا جاتا، دنیا کی گردنیں صداقت کے سامنے خود بخود جھک جاتی ہیں، سعید روحیں کفر کی تاریکیوں میں بھی ایمان کی روشنی ٹٹول لیتی ہیں، طاقت کی نمائش اُن لوگوں کا کام ہے جن کے اُصول دلائلِ عقلی کے متحمل نہیں ہو سکتے، اسلام کبھی جارحانہ پالیسی کی تائید نہیں کرتا، جن لوگوں نے مُلک گیری کی ہوس میں، لوٹ مار کی خاطر دوسرے ممالک پر حملے کیئے وہ اپنے افعال کے خود ذمہ دار ہیں، اسلام ان کو کسی اجر کا مستحق نہیں سمجھتا، اسلام دنیا میں نہ امارت (ARISTOCRACY) کی بنیاد رکھنے آیا تھا، نہ (AUTOCRACY) شخصی حکومت کی، وہ نام نہاد DEMOCRACY جمہوریت کو بھی بنی نوع انسان کے لیئے لعنت سمجھتا تھا، اُس نے

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ (تمام ایماندار آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)

پر قصرِ ملت کی بُنیاد رکھی اور ہزاروں اور لاکھوں دیوتاؤں کے بدلے وحدہ لاشریک کی عبادت کا اعلان کر کے وحدتِ انسانیت کا ایسا زبردست سبق پڑھایا جو آپ ہی اپنی نظیر تھا، اُس نے صاف صاف بتا دیا کہ انسان اور اُسکے تمام بنائے ہوئے قانون جھوٹے ہیں، اقتدار اور سیادت صرف ایک توانا اور قادر کے لیئے ہے، باقی زمین پر رہنے والے

جتنے انسان ہیں وہ سب مرتبے میں برابر ہیں، خدا کے نزدیک نہ قوم و ملک کا تفاوت ہے نہ رنگ و روپ کا، جس قادر مطلق نے قیصر ولیم کو بنایا، وہی ایک حبشی ماں کی گود میں رونے والے سیاہ فام بچے کا بھی خالق ہے اور اللہ کے نزدیک ان دونوں کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں، رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ ساری دُنیا کو یہ پیغام پہونچا دیا کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام ہر ایک بچہ خواہ وہ کوشک یلدیز[1] میں پیدا ہو یا قصر بکنگھم[2] میں، ایک مزدور کی تاریک جھونپڑی میں یا کسی کوئلے کے کان کے ایک کونے میں فطرتی طور پر "مسلم" ہوتا ہے؛

لفظ مسلم ایک دُنیا کے معانی اپنے اندر پوشیدہ کئے ہوئے ہے، مسلم وہ ہے جو دُنیا میں امن و امان کا حامی ہو، حریت کا دلدادہ ہو، اور سوائے ایک خدا کے کسی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکائے، خواہ وہ پتھر کا بُت ہو، یا سرمایہ کا دیوتا، "اسلام" ہی وہ تمدن ہے جس نے سب سے پہلے تمام ناجائز اقتدار[ون] کے خلاف مؤثر صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ رسول اسلام کی آمد سے قبل انسانیت ایک طرف تو پادریوں، پنڈتوں اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے زیر اقتدار دبی پڑی تھی اور دوسری طرف مادی حکمرانوں کے ظلم و ستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھی، رسولِ عربی نے بتایا کہ "عبد معبود" کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے،

---

[1] کوشک یلدیز ترکی خلفاء کا مشہور و معروف محل ہے [2] قصر بکنگھم شاہان انگلستان کا خوبصورت محل ہے

اور حکومت صرف اللہ ہی کو زیبا ہے، انسان سب آپس میں برابر ہیں اور ایک دوسرے کی خدمت کے لئے پیدا کیئے گئے ہیں، کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تاج و تخت کا مالک بن کر دوسروں پر ناجائز اقتدار قائم کرے، اور بنی آدم کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالے، ہم سب کو ملکر انسانیت کی گاڑی آگے بڑھانا چاہیے، جو سب سے اچھے عمل کرے گا وہی خدا کے نزدیک زیادہ بزرگ ہوگا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم

علیؑ کی زندگی مزدور طبقے کے لیے ایک درس ہدایت ہے ان کی اعلیٰ تعلیم میں دنیا کی ترقی کا راز مضمر ہے، مجھے فرصت ہوتی تو تفصیل کے ساتھ ان کے زبردست کیرکٹر پر روشنی ڈالتا، اور اگر حیات نے یاوری کی تو انشاء اللہ ان ہی صفحات میں کبھی نہ کبھی میں دنیا کے اس مشہور لیبر لیڈر کے فلسفہ پر ایک تفصیلی بحث کرونگا، سردست تو ملک کے تعلیم یافتہ طبقے سے صرف اسقدر التجا ہے کہ وہ اس گدڑی پوش فرشتہ خصائل انسان کی سیرت پر ایک غائر نظر ڈالے اور اسلام کی حقیقی تعلیم کو پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرے۔

اسلامی تاریخ کا ایک سیاہ ورق

دولتِ بنی اُمیہ کا عروج و زوال

یزید نے اسلام پر کیا احسان کیا؟

(۱) بانیٔ اسلام کی وفات داستانِ پارینہ بن گئی، تیس برس کا طویل زمانہ پلک جھپکاتے ہوئے گزر گیا، رسول اللہ کے جاں نثار صحابہ کچھ تو نذرِ اجل ہو چکے، جو باقی ہیں وہ زمانے کی حالت دیکھ کر خانہ نشیں ہیں۔ مدینہ منورہ ویران ہے، مکہ میں خاک اُڑ رہی ہے، کوفہ کے در و دیوار اپنی گزشتہ شان و شوکت پہ ماتم کر رہے ہیں، دمشق مرکزِ سلطنت بنا ہوا ہے اور بلادِ اسلام کی دولت سمٹ سمٹ کر وہاں جمع ہو رہی ہے، یوں تو دُنیا میں سینکڑوں ہی مذاہب پیدا ہوئے اور ہزاروں پیغمبر عالم وجود میں آئے، اور سب نے ایک نہ ایک دن اپنی اُمت سے رخصت ہو کر آغوشِ رحمت میں پناہ لی، لیکن رسولِ اسلام کی وفات کی داستان اسقدر دردناک ہے کہ آجتک مسلمانوں کو خون کے آنسو رُلا رہی ہے، ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد مسلمانوں کی غلط پالیسی رفتہ رفتہ

اسلام کو اس درجے پر لے آئی کہ مرکزِ دین برباد ہو گیا، مادیت روحانیت پر غالب آ گئی، اور "امن و آشتی کا پیام" "اعلانِ جنگ" (الٹی میٹم) سے بدل دیا گیا، خاموش "تبلیغ و اشاعت" کا وہ سلسلہ جو رسولِ خدا ہی کے دنوں میں یمن، ایران، روم اور ہندوستان تک پہونچ چکا تھا ہمیشہ کے لیے رُک گیا اور اسکی جگہ اُس ننگی تلوار نے لے لی جس نے نام نہاد اسلام کی روحانیت پر ایک نہ مٹنے والا داغ لگا دیا،

(۲) پیغمبرِ اسلام کا پہلا خلیفہ تیس برس کی موعودہ مدت پوری کر کے نجف کی سنسان بستی میں آسودۂ خاک ہے، اسلام کی سچی تعلیم بت پرست عربوں کے ہاتھوں پامال کی جا رہی ہے، وہ لوگ جو تلوار کے خوف سے ایمان لائے تھے، جو لالچ سے اسلام کا دم بھرتے رہے، آج اپنے اصلی لباس میں منظرِ عام پر موجود ہیں۔ اس رسول کی جانشینی کا دعوے کرنے والے جو اپنی ساری عمر ایک جھونپڑی میں گزار گیا فلک فرسا عمارتوں میں فروکش ہیں، اُن کے سر پر جواہر نگار تاج ہے، وہ قیصر و کسرے کی طرح زریں تخت پر گھٹنے سے گھٹنہ ملائے بیٹھے ہیں، آہ! جو اپنے ہاتھوں سے بکری کا دودھ دوھتا تھا جو خود مسجد کی تعمیر کے پتھر اُٹھا کر لاتا تھا، جو فاقے پر فاقہ کر کے خندق کی کھدائی میں صحابہ کا شریک رہتا تھا، اسکی نیابت کا دم بھرنے والے لونڈی غلاموں کے حلقے میں "شیشہ و مینا بدست"، "شاہدِ خوش رو بکنار" نظر آتے

ہیں، تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ بنی اُمیّہ کے ان افراد کو منہ لگا کر جو کھلم کھلا اسلام کے دشمن تھے، جن کے غدارانہ رویے نے پیغمبرِ اسلام کو اُن کے خلاف

لہ علامہ مسعودی تاریخ مروج الذہب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قدم على عثمان عمه الحكم بن العاص ومروان وغيرهما من بني امية و مروان هو طريد رسول الله صلعم الذي غربه عن المدينة ونفاه عن جواره .... وكان عماله جماعة منهم الوليد بن عقبة بن ابي معيط (اخو عثمان لامه) على الكوفة وهو ممن اخبر النبي صلعم انه من اهل النار .... ان الوليد بن عقبة كان يشرب مع ندمائه ومغنيه من اول الليل الى الصباح فلما اذن المؤذن بالصلوة خرج منفضلا في غلائله فتقدم الى المحراب في الصلوة الصبح فصلى بهم اربعة فقال تريدون ان ازيدكم۔

جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو ان کے چچا حکم بن العاص اور مروان بن الحکم طریدِ رسول اللہ مع دیگر بنی امیہ کے ان کے گرد آ کر جمع ہو گئے۔ مروان وہ ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے مدینے سے نکال دیا تھا اور اس کے قرب و جوار میں بھی آنے کی ممانعت فرما دی تھی۔ حضرت عثمان نے جو عمال مقرر فرمائے تھے ان میں ان کے مادری بھائی ولید بن عقبہ بھی تھے، یہ کوفے کے گورنر تھے، رسول اللہ نے ان کے دوزخی ہونے کی خبر دی تھی۔ یہ تمام رات اپنے مصاحبین اور اربابِ نشاط کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول رہتے تھے، جب مؤذن صبح کی نماز کے لئے خبردار کرتا تو نشے کی حالت میں مسجد میں جا کر لوگوں کو نماز پڑھا دیتے اور دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھا کر کہتے "کہو تو چار رکعت اور زیادہ کر دوں"۔

تاریخ ابو الفدا میں ہے:۔

ثم دخلت سنة تسع و عشرين فيها عزل عثمان عمرو بن العاص عن مصر وولاها عبد الله بن سعد بن ابی سرح وكان اخا عثمان من الرضاعة وكان رسول الله صلعم قد هدر دمه يوم الفتح

سنہ ۲۹ھ میں حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کو حکومتِ مصر سے معزول کر کے اس کی جگہ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو حاکم مقرر کیا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا قتل رسول خدا نے بروز فتح مکہ مباح کر دیا تھا۔

جن لوگوں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ بنی اُمیہ خوف سے اسلام لائے اور لالچ سے اُس پر قائم رہے۔ ابو سفیان مرتے دم تک اپنے پرانے عقائد سے دست کش نہ ہوا، چنانچہ استیعاب ابن عبد البر میں ہے کہ جنگ یرموک میں رومیوں کا غلبہ دیکھ کر ...... (بقیہ آئندہ صفحہ پر) ....

عملی قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا تھا، جن میں سے بعض کا مدینہ میں داخلہ بند تھا، بعض کے نام اس فہرست میں موجود تھے جس میں منافقین کی تصریح تھی، مُدبرین ملتِ محمدیہ نے ایک ایسے فتنہ کا دروازہ کھول دیا جس کے بڑھتے ہوئے اثرات آجتک دنیا کے "خرمنِ امن" پر بجلیاں گرا رہے ہیں، اللہ اللہ کہاں اُس محرمِ خلافت محرمِ اسلام کا وہ حُسنِ تدبر کہ ابوسفیان کی "پیش کشِ نصرت" کو رد کر دیا، اور کہاں مشہور و معروف سیاست دانوں کی یہ (دانستہ یا نادانستہ) غلطی کو امن پسند اور صلح جو مسلمانوں کی گردنوں پر اُن ہنگامہ آفریں، فتنہ دوست،

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ...... یہ خوشی کے مارے اُچھلنے لگتے تھے اور جب مسلمانوں کا غلبہ دیکھتے تو کفِ افسوس مل کر کہتے ہائے روم کے بادشاہوں کا نام مٹ رہا ہے، اس کتاب میں یہ اجزا بھی تحریر ہے

ان ابا سفیان دخل علی عثمان حین صارت الخلافة الیه فقال قد صارت الیك بعد تیم وعدی فادرها كالكرة واجعل اوتادها بنی امیه فانما هو الملك ولا ادری ما جنة ولا نار

جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان اُن کے پاس آکر کہنے لگے کہ بنی تیم (خاندان ابوبکر) اور بنی عدی (خاندان عمر) کے بعد اب خلافت تم کو پہنچی ہو تو اس کو گیند کی طرح جدھر چاہو پھراؤ اور بنی امیہ کو اس کی میخیں بناؤ (یعنی اسکو حکام ہوں) یہاں پر سلطنت ہے، رہی جنت و دوزخ تو اس کا تو میں قائل نہیں۔

ہے معاویہ تو ان کے ایمان کی حالت اُس خط و کتابت سے ظاہر ہے جو بقول علامہ مسعودی ان کے اور محمد ابن ابی بکر کے درمیان ہوئی، اور پھر جو شخص (استیعاب ابن عبد البر اور مروج الذہب مسعودی کی شہادت کے مطابق) امام حسن علیہ السلام کو قتل کرائے، اور (ابو الفدا اور کامل ابن اثیر کے قول کے بموجب) حضرت علیؑ پر لعنت کرنے کا رواج ڈالے اُس کا ایمان و اسلام ظاہر ہے، یزید کو مسلمان کہنا اسلام کی توہین کرنا ہے،

آلِ مروان جو یزید کے بعد مالکِ تخت و تاج ہوئی ان کی بے دینیوں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔

اور ظلم پسند بزرگوں کے خاندان بھر کو مسلط کر دیا، حیرت ہے کہ وہ محتاط آنکھ جو خالد ابن ولید کی دست درازیوں کو گوارا نہ کر سکی، جس نے (بقول بعض) انصاف کے پیچھے اپنے لختِ جگر کو خاک و خون میں ملا دیا، اموی چالوں کو دیکھ کر کیوں خاموش رہی، حد ہو گئی کہ وہ مجسمۂ حیا، پیکرِ رحم جس کی سادگی پر حال و قال کی محفلوں میں آج تک وجد طاری ہوتا ہے ان اخلاق سوز دین فروشوں کے بیجا تسلط اور ناجائز اقتدار کے نیچے دب کر رہ گیا، اور ان تمام چشم پوشیوں کا نتیجہ بالآخر ملتِ اسلامیہ کے افتراق و تشتت کی صورت میں پیدا ہوا، وہ تلوار جو اس مبارک دور میں نیام سے برآمد ہوئی تھی اُس وقت تک برسرِ جنگ رہی جب تک اجنبی ہاتھوں نے اُسے چھین نہ لیا اور جب یہ تلوار چھین گئی تو معلوم ہوا کہ نام نہاد اسلام قسمت آزما لٹیروں کی ایک "ٹھگ بدیا" تھی جو طاقت اور سطوت کے بھروسہ پر مدتوں تک دُنیا پر مسلط رہی، اور بالآخر تمدن اور تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اُس کو ہمیشہ کے لیے کسی گمنام مقام کی طرف بہا دیا، مسلمان، نام نہاد مسلمان آج بھی اپنے بازؤں کی طرف دیکھتے ہیں اور اگر ان کے ہاتھ میں تلوار ہو تو وہ اس وقت بھی "امن سوزی" کی اُن داستانوں کو زندہ کر سکتے ہیں جو مدتوں سے صرف زینتِ تاریخ بن کر رہ گئی ہیں۔

(۳) "مصلحِ اعظم" کی وفات دُنیا کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی، ان کا لگایا ہوا

باغ برباد کیا جا رہا تھا، جزیرۃ العرب ایک مرتبہ پھر اپنی پرانی بُت پرستی اور توہم پسندی کی طرف مائل ہونے کو تھا، اسلام کی "باگ ڈور" ان بدوی عربوں کے ہاتھ میں تھی جو اونٹوں کی مہار پکڑتے پکڑتے تختِ سلطنت تک پہونچ گئے تھے، ابو سفیان کا فرزند ہر چہار طرف سے مطمئن ہو کر دمشق کے قصرِ خلافت میں مشغولِ عیش و عشرت تھا، کہ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا آؤ اس سلطنت کو ہمیشہ کے لیے اپنے خاندان کی ملکیت بنا دوں، عمرو عاص جیسے ایمان فروشوں کا دم میں دم ہے تو یزید کی بیعت چنداں مشکل نہیں، یہ خیال اموی ڈپلومیسی کا سب سے بڑا کمال تھا اور اسلامی مؤرخ اس پر جسقدر چاہیں خیال آرائیاں کریں مگر سچ تو یہ ہے کہ اسی ایک عمل نے اسلام کی لاج رکھ لی، یزید کا تختِ خلافت پر جلوہ افروز ہونا "مدبرینِ اسلام" کی اُس پالیسی کا اعلان تھا جو خفیہ یا علانیہ طور پر مدتوں سے برسرِ کار تھی، معاویہ کے بعد اگر یزید خلیفہ نہ ہوتا تو یہ تحفہ عبداللہ ابن زبیر یا عبداللہ ابن عمر کے ہاتھ لگتا، لیکن اس صورت میں "حق و باطل" کے درمیان اس قدر بین تمیز قائم نہ ہوتی، ہم یزید کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے اپنی قوتِ عمل سے اس زبردست ڈرامہ کا آخری سین دنیا کے سامنے پیش کر دیا جو بڑے بڑے دماغوں نے ترتیب دیا تھا، اور اپنی اس شاندار حرکت سے ایک طرف بنی اُمیہ کے تابوت میں آخری کیل جڑ دی اور دوسری طرف حقیقی اسلام کی اس صلح پسندانہ پیرٹ

کو ظاہر ہونے کا موقع دیا، جو مدتوں سے مادی دنیا کی نظروں سے چھپی پڑی تھی ظلم و ستم کا یہ صاحبِ حشمت دیوتا اپنے خون سے رنگین ہاتھوں کے ذریعہ اُن حقائق و معارف کے چہرے سے نقاب اُلٹ گیا جو خدا جانے ابھی کتنی مدت تک پوشیدہ رہتے، غور سے دیکھئے! یہ یزید ہی کے ظلم کھلا مظالم[1] کا نتیجہ تھا کہ اسلامی دنیا کے کونے کونے سے "محبتِ آلِ محمدؐ" کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور اسی تخت پر سے جس کے مالک نے اہلبیتؑ کی تباہی کا فرمان جاری کیا تھا، ایک مرتبہ اہلبیتؑ کے حقوق کا اعتراف کیا گیا، حیوۃ الحیوان دمیری کھول کر دیکھئے کہ یزید کے لخت جگر معاویہ نے کس دلچسپ اور پُر زور طریقے پر اپنے آباؤ اجداد کی سیہ کاریوں اور آلِ محمدؐ کی خدماتِ دین اور استحقاقِ خلافت کا بہ موقع اظہار کیا ہے ؎ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد ....

امام حسن علیہ السلام کی صلح پسندی اور کربلا کی یادگار جنگ نے دراصل یہی نتائج

---

[1] یزید کے مظالم کی فہرست بہت طولانی ہے۔ اُس نے سرزمین کربلا پر بنی فاطمہؑ کے قتل عام اور کوفہ و شام میں دختران پیغمبرؐ کی تشہیر و اسیری ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ سنہ ۶۳ ہجری میں جب اہل مدینہ نے اُس کی بیعت سے علٰحدگی اختیار کی تو اُس نے مسلم بن عقبہ کو دس ہزار سواروں کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا، (بقول مورخ ابو الفدا) یہ ظالم حرہ کے راستے سے مدینہ میں داخل ہوا اور اس مقدس شہر کے گلی کوچے کو مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا، سات سو مہاجرینؓ و انصار دس ہزار دیگر عوام تہ تیغ ہوئے، تین دن تک لوٹ مار، قتل و غارت اور عورتوں کے ساتھ .... کا بازار گرم رہا، مسجد رسول میں گھوڑے داخل ہوئے، روضۂ رسول کو اصطبل بنایا گیا، سنہ ۶۳ ہجری میں یہ بلا مکہ کی طرف نازل ہوئی، مگر راہ ہی میں موت کے فرشتے نے آ پکڑا، حصین بن نمیر نے جو اس کا قائم مقام تھا کہ اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی یہاں تک کہ یزید کے مرنے کی خبر سُن کر یہ لشکر شام کی طرف بھاگا۔

اقتدار پر وہ کاری ضرب لگائی کہ جس کی نظیر تاریخ عالم میں دوسری جگہ نہیں ملتی، دُنیا کا بڑے سے بڑا مؤرخ بھی ہمارے سامنے کوئی ایسی قوم نہیں پیش کر سکتا جو بنی اُمیہ کی طرح نیست و نابود ہو گئی ہو، وہ بلند مرتبہ تدبر اور وہ اعلیٰ درجے کی سیاست جو اہلبیتؑ نے دُنیا پر ظاہر کی آج بھی امنِ عالم کی ضامن بن سکتی ہے اور اس کی بدولت مادہ پرست یورپ کی ہنگامہ آفرینیاں باہمی محبت سے تبدیل ہو سکتی ہیں، وہ شمع جس نے عرب کی تاریکیوں کو مٹا دیا، اسلام کی وہ موافقِ فطرت تعلیم جس نے جاہل بُت پرستوں کو بھی رام کر لیا، کیا آج تہذیب یافتہ دنیا کو عالمگیر اخوت کے سلسلے میں منسلک نہیں کر سکتی؟ لیکن کون ہے جو خدا کا نام لے کر اُٹھے اور فلسفہ اور تمدن کی تاریکیوں میں بھٹکنے والی قوموں کو توحید کی شمع دکھا کر راہِ راست پر لائے، ہیبت اور استبداد کا دور گیا، اور اب ہر ایک انسان کی نگاہیں اُس تسکین بخش تعلیم کو ڈھونڈھ رہی ہیں جو نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی ترقی کی طرف رہنمائی کرے، آج معاویہ اور یزید جیسے نام نہاد مسلمانوں کی سوانح عمریاں اسلام کی تبلیغ کے لیے مفید نہیں ہو سکتیں، ہر مذہب میں اچھے اور بُرے بادشاہوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن اُن کے اعمال سے اس مذہب کی خوبی یا بُرائی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، مذہب کی اصلی حقیقت دیکھنا ہو تو اُن شہدائے راہِ خدا کو جا کر دیکھو جنھوں نے اصول کی خاطر جان دے دی، اُن "پابندانِ سلاسل"

کا نظارہ کرو جو عمر بھر قید خانوں میں رہے مگر اپنے عقائد کو ہاتھ سے نہ دیا، ہاں ہاں ان بچوں اور عورتوں کا حال پڑھو جو بھوک اور پیاس کی تکلیفیں برداشت کرتی رہیں مگر اپنے مذہب کی آن کو نہ چھوڑا، نصرانیت کی صداقت قسطنطین[1] اعظم کے محلوں میں نہیں بلکہ ان شہیدوں کی قبروں میں ملے گی جو عمر بھر یہودیوں کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہے، بُدھ مذہب کا جاہ و جلال دیکھنا ہو تو میکڈو[2] کے دربار کو چھوڑ کر ان بلاکشان ہند کی خاک کے ڈھیروں کو دیکھو جو راجپوتوں کی تلوار کے گھاٹ اُتار دیے گئے تھے، اسی طرح اے طالب حقیقت! اسلام کو بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے قصرِ خلافت میں تلاش نہ کر، وہ مدینہ، کربلا، کاظمین اور سامرہ کی قتل گاہوں اور کوفہ و دمشق و بغداد کے قید خانوں میں جلوہ آرا ہے، اسلامی اخلاق تاجداروں کے کیرکٹر کا پابند نہیں، اس کو آلِ محمدؐ کے اُن کھدر پوشوں کے اندر دیکھ جو اپنی ساری عمر فقر و فاقہ میں بسر کر کے اسلامی صداقت کا وہ منارۂ ہدایت قائم کر گئے جو قیامت تک ظلم و ستم کی آندھیوں سے غرقاب ہونے والے جہازوں کی رہنمائی کرتا رہے گا، سلسلۂ محمدیہ کی ایک ایک کڑی اپنی شان میں نرالی ہے، اور ان بارہ

---

[1] مشہور رومی بادشاہ جس نے عیسائی مذہب کی تبلیغ میں بڑا حصہ لیا تھا۔ شہر قسطنطنیہ اُسی کے نام سے موسوم ہے

[2] جاپان کے بادشاہ کا خطاب۔

کڑیوں کے ملنے سے جو زنجیر بنتی ہے وہی در اصل "حبل اللہ" ہے، ان میں سب سے پہلی کڑی جس کی پیدائش نے اِس مہینہ (رجب) کو چار چاند لگا دیئے ہیں، متضاد صفات کی حامل تھی، جس کے زور کا یہ حال ہو کہ ایک دن درِ خیبر کو ہلا دے وہ دوسرے دن سُوکھے ٹکڑے توڑنے کی تاب نہ لا سکے، جس کی شجاعت کا یہ عالم ہو کہ عمرو ابن عبدود جیسے مشہور پہلوان کے دو کر دے وہ مذہب کی خاطر رسن بستہ ہو کر حکومتِ وقت کے سامنے پیش ہونے میں تامل نہ کرے، جو دوسروں کی مشکلکشائی کا شائق ہو وہ اپنے گھر کو جلتا ہوا دیکھ کر اُف نہ کرے، اے دنیا کے سب سے بڑے مدبّر! اے فاطمی سلطنت کے سب سے پہلے تاجدار! میں اپنا عقیدت مندانہ سلام تیرے حضور میں پیش کرتا ہوں، آج دُنیا تیرے کارناموں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے کہ تو نے قیصر و کسریٰ کے تخت پر بھی اپنی مزدورانہ شان کو ہاتھ سے نہ دیا، اے دین و دنیا کے سردار! تیرا وہ خلعتِ شاہی جو بہتر پیوندوں سے مزین تھا آج عالم کے تاجداروں کے لیے قابلِ رشک ہے، تیری امن پسندی اور صلح جوئی نے اُن ہیبتناک شخصی حکمرانوں کے خود ساختہ اصولوں کی قلعی کھول دی، جو خفیہ سازشوں کی مدد سے ظلم و ستم کے بھروسہ پر مال و دولت کی تمنا میں، اپنے ہمجنسوں کی گردنوں پر سوار ہوتے رہتے ہیں، اے پیکرِ حرّیت! تو نے آزادیٔ ضمیر اور حریّتِ عمل کو عام کر کے عرب کی ملتِ خوابیدہ کو ایک

مرتبہ پھر بیدار کردیا، تو نے رسول اللہ کے بعد اپنے چند روزہ دورِ خلافت میں خدا پرست اور حق گو مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت[1] پیدا کردی جو شاہانِ بنی امیہ

---

[1] تاریخ اسلام کی ورق گردانی کیجئے، علیؑ کے صحابہ نے سلاطین جور کے عہد میں جس بے باکی سے اعلانِ حق کیا ہو اس کی مثال اس عہدِ جدید میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے۔ میثم تمار، قنبر، حجر بن عدی، وغیرہ کا نام رہتی دُنیا تک یادگار رہے گا، کہ ان بزرگوں نے جان پر کھیل کر آزادیٔ ضمیر اور حریتِ عمل کو برقرار رکھا، اور آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا کردیئے کہ اموی حکومت کا چراغ گل ہو گیا، علیؑ کے بعد پیروانِ علیؑ پر کیا کیا مصیبتیں گزریں اور ان دیندار بزرگوں نے کس کس طرح ان مصائب کا مقابلہ کیا، اس کے بیان کرنے کے لیے تو ایک علٰحدہ کتاب کی ضرورت ہے، صرف ایک واقعہ تاریخ ابوالفدا سے نقل کیے دیتا ہوں

وکان معاویة و عماله یدعون لعثمان فی الخطبة یوم الجمعة ویسبون علیا ولما کان المغیرة متولی الکوفة کان یفعل ذالك طاعة لمعاویة فکان یقوم حجر و جماعة معه فیردون علیه سبه لعلی وکان المغیرة یتجاوز عنهم فلما ولی زیاد دعی لعثمان وسب علیا فقام حجر و قال کما کان یقول من الثناء علی علی فغضب زیاد وامسکه و اوثقه بالحدید وثلاثة عشر نفرا معه وارسلهم الی معاویة من قتلهم بعد راء ………… وکان حجة اعظم الناس دینا وصلوة

معاویہ اور ان کے عمال خطبۂ جمعہ میں حضرت عثمان کو دعائیں دیتے تھے اور حضرت علیؑ پر سب و شتم کرتے تھے: چنانچہ جب مغیرہ والیٔ کوفہ تھے وہ بھی معاویہ کے اس حکم کی تعمیل کیا کرتے تھے، تو اس وقت حجر بن عدی مع اپنے ساتھیوں کے کھڑے ہو جاتے اور اس کی تردید کرتے، مغیرہ حجر بن عدی سے کچھ باز پرس نہ کرتا تھا، مگر جب زیاد نے عامل کوفہ ہو کر برسرِ منبر حضرت عثمان کو دعائیں دیں اور حضرت علیؑ کو برا بھلا کہا اور حسب معمول حجر نے حضرت علیؑ کی تعریف کی تو زیاد غضبناک ہوا اور اس نے حجر کو مع ان کے تیرہ ساتھیوں کے پابجولاں کر کے معاویہ کے پاس بھیج دیا، انھوں نے سب کو مقام عذراء پر قتل کرادیا، = حجر بن عدی دینداری اور نماز گزاری میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔

اسی طرح تاریخ طبری میں ہے:—

لما دخل عبیداللہ القصر نودی الصلوة الجامعه

جب ابن زیاد قصر امارت میں آیا تو یہ ندا کی گئی کہ نماز تیار ہے …. (بقیہ صفحہ آئندہ میں)

کے مظالم کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کرتی رہی اور بالآخر اُن کے ہیبتناک دورِ تشدد کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوئی، اے اسلام کے کھدر پوش شہنشاہ! میں استبداد پسند، سرمایہ پرست، مسلمان نما یہودیوں سے منہ موڑ کر تیرے دروازے پر سر جھکاتا ہوں

صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) فاجتمع الناس فی المسجد الاعظم فصعد المنبر فقال الحمد للہ الذی اظہر الحق ونصر امیر المومنین یزید بن معاویۃ وحزبہ وقتل الکذاب ابن الکذاب الحسین بن علی وشیعتہ .... فلما سمع عبداللہ ابن عفیف الازدی مقالۃ ابن زیاد، قال یا ابن مرجانۃ ان الکذاب ابن الکذاب انت وابوک والذی ولاک وابوہ یا ابن مرجانۃ اتقتلون ابناء النبیین وتکلمون بکلام الصدیقین فقال ابن زیاد علی بہ ...... فاخذوہ

اور لوگ جامع مسجد میں جمع ہوئے، ابن زیاد نے منبر پر جا کر کہا کہ اُس خدا کا شکر ہے جس نے حق کو ظاہر کیا اور امیر المومنین یزید بن معاویہ اور اس کی پارٹی کو فتح دی اور (معاذ اللہ) کذاب ابن کذاب حسینؑ بن علیؑ اور ان کے شیعوں کو قتل کیا، ابن زیاد کی یہ تقریر سن کر عبداللہ ابن عفیف ازدی نے کہا اے مرجانہ کے بیٹے کذاب تو تیرا باپ اور کذاب وہ ہے اُس کا باپ جس نے تجھ کو یہاں کا حاکم بنایا ہے، اے ابن مرجانہ تو نبیوں کی اولاد کو قتل کرتا ہے اور سچوں کی سی باتیں بناتا ہے؟ ابن زیاد نے غصہ میں آکر کہا کہ اس کو میرے پاس لے آؤ، لوگ عبداللہ ابن عفیف کو پکڑ کر اُس کے پاس لے گئے۔

تاریخ کامل ابن اثیر میں تحریر ہے:-

وقتلہ وامر بصلبہ فی المسجد فصلب رحمہ اللہ

ابن زیاد نے عبداللہ ابن عفیف کو قتل کر دیا اور حکم دیا کہ ان کو مسجد میں دار پر چڑھا دیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اللہ اُن پر رحمت فرمائے۔

دُنیا کی نمائشگاہِ مذاہب میں اسلام کی کیا ضرورت تھی

اسلام ذہنی، عقلی اور رُوحانی فتوحات کے لئے آیا تھا

دُنیا میں ہزاروں مذاہب ہیں، اور اگر ان تمام کتابوں کو جو آسمانی کہلاتی ہیں ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو اچھا خاصہ انبار لگ جائے، میں نے شرِیمد بھگوت گیتا،[1] تری پٹاکا، توریت، زبور اور انجیل کا غور و خوض سے مطالعہ کیا ہے، اور تاریخ کی مدد سے سری کرشن، مہاتما گوتم بدھ، حضرتِ موسیٰ، حضرتِ داؤد اور حضرتِ عیسیٰ کے حالاتِ زندگی بھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، بیشک ان تمام کتابوں میں روحانیت کا ایک بہت

---

[1] شرِیمد بھگوت گیتا۔ ہندوؤں کی وہ مقدس کتاب جو کرشن جی کی طرف منسوب ہے
تری پٹاکا۔ بدھ مذہب کی ایک کتاب جس میں گوتم بدھ کے حالات ہیں۔
توریت۔ وہ کتاب جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی۔
زبور۔ حضرت داؤد کی کتاب
انجیل۔ حضرت عیسیٰ کی کتاب

بڑا ذخیرہ موجود ہے، لیکن وہ دشواریاں اور دقتیں جو اس خاک کے پتلے کو کشمکش حیات اور میدانِ عمل میں پیش آتی ہیں یا تو سرے سے ان کتابوں کے موضوع سے خارج ہیں یا اُن کا ایسا حل پیش کیا گیا ہے جس پر ہر زمانے میں عمل نہیں ہو سکتا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود ان مقدس ہستیوں کا "اسوۂ حسنہ" جو ان آسمانی کتابوں کو لے کر آئے تھے عملاً ان اصول و قوانین کی صداقت ظاہر نہیں کرتا جن کو وہ دُنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، سری کرشن اور گوتم بدھ کی سوانح عمریوں کو خوش اعتقادی اور توہم پسندی نے امتدادِ زمانہ کے ساتھ ملکر ایک داستانِ امیر حمزہ" بنا دیا ہے کہ بڑے سے بڑا نقاد مؤرخ بھی حقیقتِ حال کا پتہ لگانے سے قاصر ہے۔ حضرت موسٰی اور حضرت داؤدؑ اُن کے حالات کچھ تو طالمود[1] کے قصوں اور کچھ مستند تاریخوں میں آج بھی دستیاب ہوتے ہیں، مگر ان کا مطالعہ ناظرین کے سامنے ایک ایسے مصلح اور معلمِ اخلاق کی تصویر پیش نہیں کرتا جس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر عملی روشنی ڈالی ہو، حضرت عیسیٰ کی زندگی کا ہر واقعہ اناجیلِ مقدسہ میں موجود ہے، اُن کے وہ زبردست مواعظ جنھوں نے عبرانی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی حرف بحرف قلمبند ہو چکے ہیں، مگر ان کی زندگی میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو خواہ مخواہ دنیا کی توجہ اپنی

[1] طالمود۔ بنی اسرائیل کی ایک کتاب جس میں انبیا کے قصے اور مذہبی روایتیں درج ہیں۔

طرف مبذول کر سکے، تصفیۂ قلب، تزکیۂ نفس اور معراجِ روحانی کے حصول میں شاید عیسوی تعلیم کچھ مدد دے سکے لیکن نظامِ مجلسی، تمدنِ عالم اور حقوقِ عباد کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ کی انجیل کوئی نمایاں رہنمائی نہیں کرتی۔

دنیا نام نہاد مذہبی گورکھ دھندوں سے جن کا تعلق محض تخیل سے تھا پریشان تھی، لوگ ان پیچیدہ فلسفی عقیدوں سے جو عارضی طور پر سرور پیدا کر سکتے تھے، بالکل بیزار ہو چلے تھے، قوتِ عمل مدتوں سے بیکار پڑی تھی، ذہنی طاقتیں فرسودہ عقائد اور اندھی تقلید کی بدولت زنگ آلودہ ہو گئی تھیں کہ یکایک فاران کی چوٹیوں پر وہ حقیقی نور چمکا جس نے دُنیا کے جہالت کدے کو ایک مرتبہ پھر چمکا دیا اور علم و فضل، تحقیق و تدقیق کا وہ حقیقی جذبہ جو فطرتاً انسان کو ودیعت کیا گیا ہے موافق آب و ہوا میں تربیت پانے لگا، اگر رسولِ اسلام دوسرے مذہبی پیشواؤں کی طرح محض ایک معلمِ اخلاق اور داعیِ حق ہی ہوتے تو بے شک اُن کے اور دُنیا کے دوسرے بانیانِ مذاہب کے درمیان کوئی فرق نہ رہتا، اور سچ تو یہ ہے کہ درجنوں مذاہب کی موجودگی میں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک "فلسفۂ اخلاق" موجود تھا، رسولِ اسلام کا ادعائے نبوت فرمانا چنداں ضروری نہ تھا، مگر سب سے زبردست خصوصیت جو ہمارے نبی کو دیگر بانیانِ مذاہب سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ صرف معلمِ اخلاق ہی نہیں تھے بلکہ دُنیا کے سامنے اپنی مقدس زندگی پیش کر کے عملاً اپنے فلسفے کی

صداقت پیش کرنا چاہتے تھے، انھوں نے کرشن، بدھ، موسیٰ، داؤد، اور عیسیٰ کی طرح صرف تصویر کا ایک رُخ ہی دُنیا کے سامنے پیش نہیں کیا بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی فرمائی،

غور اور فکر کے بعد انسانی تعلقات کو دو قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) متعلق بہ معاد (۲) متعلق بہ معاش

(۱) متعلق بہ معاد[۱] ۔ وہ تعلقات جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں اور جن کا تعلق زیادہ تر آخرت سے ہے، ظاہر ہے کہ اسلام نے جس زبردست اور مکمل عنوان سے معاد کی تعلیم پیش کی تھی اُس کو رسولِ اسلام نے اپنے نمونہ سے اہلِ عالم کے لیے یادگار بنا دیا، دُنیا کا کوئی مذہب جس طرح ایسی زبردست تعلیم معاد پیش کرنے سے قاصر ہے اسی طرح اُس پر عمل کرنے والوں کی مثال بھی اپنی تاریخ میں نہیں دکھا سکتا، اگر طوالت کا خیال نہ ہوتا تو ہم تاریخی

---

[۱] مزید غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ہر تعلیم - معاد و معاش - دونوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

الدنیا مزرعة الآخرة ، یہ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے

اسلامی عبادت اگر ایک طرف ثوابِ آخرت کا باعث ہے تو دوسری طرف دُنیا میں بھی اس سے بیشمار فوائد حاصل ہوتے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، حج اور جہاد سبھی سب سوسائٹی کے لیے بھی مفید ہیں، نماز اور خصوصیت کے ساتھ نمازِ جماعت میل جول اور اتحاد باہمی کا زبردست ذریعہ ہے پھر دُنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک قبلہ کی طرف جھکنا وحدتِ مرکز کی یاد دلاتا ہے، اور روزہ تزکیۂ نفس اور ازالۂ امراض کے علاوہ اقتصادی طور پر بھی قوم کے لیے مفید ہے، زکوٰۃ و خمس تقسیمِ دولت کا بہترین ذریعہ ہیں، حج کے موقع پر دُنیا بھر کے مسلمانوں کے اجتماع کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے، رہا جہاد تو اس کی افادیت تو ظاہر ہے کہ بغیر اس کے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔

حوالے دے کر بتاتے کہ مقدس شارع اسلام نے کس طرح رات رات بھر کھڑے ہو کر خدا کی عبادت کی ہے اور کس طرح پے در پے روزے رکھے ہیں۔

(۲) متعلق بہ معاش۔ دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے، عزیزوں قریبوں اور ہمسایوں سے ربط و ضبط، بنی نوع انسان کے حقوق، ملک و ملت کی بہبودی کا جو عدیم المثال دستور العمل اسلام نے پیش کیا ہے، اُس پر رسول اسلام نے پورے پورے طور پر عمل کر کے اپنے آپ کو دُنیا کے لیے ایک نمونہ[1] بنا دیا۔ حضرت صلعم نہ کرشن کی طرح ایک خیالی فلاسفر تھے، نہ گوتم بدھ کی طرح تارک الدنیا، وہ نہ داؤدؑ کی طرح صرف ایک عبادت گزار تھے، نہ عیسیٰؑ کی طرح محض ایک واعظ، وہ انسانِ کامل تھے نمونۂ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو

---

[1] اس سلسلے میں مورخ ابو الفدا کی یہ عبارت پڑھنے کے لائق ہے:-

وکان صلعم ارجح الناس عقلا وافضلهم رأيا وكان يحب المساكين لا يحقر فقيرا لفقره ولا يهاب ملكا لملكه يؤلف قلوب اهل الشرف ويؤلف اصحابه ولا ينفرهم وما صافحه احد فيترك يده حتى يكون ذلك الرجل هو الذی ترك يده ويحلب العنز و يجلس على الارض و كان يخصف النعل ويرقع الثوب وعن عائشة قالت ما ضرب رسول الله خادما ولا امرأة لا قط

بلحاظ عقل و رائے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ سب سے افضل تھے، مساکین کو دوست رکھتے تھے، نہ فقیر کو اس کے فقر کی وجہ سے حقیر جانتے تھے، نہ بادشاہ کا اس کی بادشاہت کی وجہ سے خوف کرتے تھے۔ شریف لوگوں اور اپنے اصحاب کی دلجوئی اور تالیف قلب کا خیال رکھتے تھے، اور جب کسی سے مصافحہ فرماتے تو اُس وقت تک اپنا ہاتھ نہ چھوڑتے تھے جب تک وہ خود ہی نہ چھوڑ دے، بکری کا دودھ اپنے ہاتھ سے دُوہ لیتے تھے، زمین پر بلا تکلف بیٹھ جاتے تھے، اپنے جوتوں کی مرمت کرنے اور کپڑوں میں پیوند لگانے سے بھی عار نہ تھا، حضرت عائشہؓ نقل کرتی ہیں کہ آنحضرت نے کبھی کسی خادم یا خادمہ کو زدوکوب نہیں کیا۔

کی مشکلات کا ذاتی تجربہ حاصل کیا تھا، اور چونکہ وہ دیوتا، ابن اللہ اور انسانی حیثیت سے بالاتر نہ تھے، اس لیے ان کو بنی آدم کی تمام کمزوریوں کی خبر تھی اور وہ ان تمام حالات سے واقف تھے جو آئے دن دُنیا والوں کو پیش آتے رہتے ہیں، رسولِ اسلام کے حالاتِ زندگی پڑھیے، اور پھر تھوڑی دیر منصفانہ انداز سے اُن پر غور کیجیے، تو ثابت ہو جائے کہ وہ محض ایک زبانی جمع خرچ کرنیوالے انسان نہ تھے، بلکہ ایک مہربان باپ، فرمانبردار فرزند، انصاف پسند شوہر، عادل اور منتظم شہنشاہ، سلیقہ شعار جنرل (سپہ سالار) اور بہادر جانباز اور محنت کش سپاہی تھے، اِن کی خانگی زندگی کے دلچسپ واقعات زباں زدِ عوام ہیں، اپنی بیٹی فاطمہؓ کی تربیت اور تعلیم اس انداز سے فرمائی کہ وہ دُنیا کی تمام عورتوں کے لیے ایک نمونہ بن گئیں، اس عہد میں جب بیٹیاں زندہ درگور کر دی جاتی تھیں، جب کسی گھر میں لڑکی کا پیدا ہونا فالِ بد سمجھا جاتا تھا، رسولِ اسلام کا اپنی دختر کی تعظیم و تکریم فرمانا اور اُن کے حُسنِ عمل کا تذکرہ سُنا کر دُنیا کو نیکی کی تعلیم دینا، دراصل دُختر کشی کی قدیم رسم مٹانے کی طرف ایک عملی قدم تھا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ کا حکم اگر رسولِ کریم کے

---

[1] اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ تم افلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، اور جو خدا تم کو رزق دیتا ہے وہی تمہاری اولاد کو بھی دے گا۔ دختر کشی دراصل ایک اقتصادی مسئلہ تھا، بیٹے کے متعلق تو یہ اُمید تھی کہ جوان ہو کر کمائے گا، خود کھائے گا، ماں باپ کو کھلائے گا، مگر بیٹی ہمیشہ خاندان پر بار رہے گی، آہستہ آہستہ اس میں غیرت و حیا کا عنصر بھی شامل ہو گیا کہ کوئی ہمارا داماد کیوں کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ عرب میں توازنِ صنفین قائم نہ رہا،.... (بقیہ آئندہ صفحہ پر)....

عملی نمونہ سے نہ ملتا تو خاطر خواہ نتائج مشکل سے برآمد ہوتے، عربوں کا خیال تھا کہ بقائے نسل صرف لڑکوں کے ذریعے ہوتی ہے اور لڑکیاں ایک وبالِ جان اور ننگِ خاندان ہیں، قدرت نے دکھا دیا کہ رسول کی نسل صرف لڑکی کے ذریعے قائم رہی اور اس برگزیدہ دختر نے وہ نام روشن کیا کہ بلا مبالغہ اگر سیدۂ طاہرہ کا وجود نہ ہوتا تو نہ صرف رسولِ اسلام کا نام بلکہ اسلام کا نام بھی دُنیا سے مٹ جاتا کیونکہ ملتِ محمدیہ کا وہ زبردست سرفروش مجاہد جس نے اپنی جان پر کھیل کر اسلام کو بچا لیا۔ فاطمہؑ ہی کی گود کا پلا ہوا تھا، رسولِ اسلام کے حُسنِ تربیت کا یہ اثر تھا کہ فاطمہؑ کی آغوش کے پلے ہوئے ہمیشہ اسلام کے آڑے وقت میں کام آئے، رسولِ اسلام نے نہ صرف فرائضِ پدری کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا بلکہ وہ ایک فرمانبردار فرزند بن کر بھی اہلِ عالم کے لیے ایک یادگار

(بقیہ صفحہ گزشتہ) .... یعنی مرد زیادہ ہو گئے اور عورتیں کم، اس مسئلہ کا حل اس طرح کیا گیا تھا کہ لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے لڑکیاں لائی گئیں، بردہ فروشی کے بازار قائم ہوئے، اسلام نے جو بکثرت رسم غلامی کو بند نہیں کیا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسا کرنے سے توازنِ صنفین قائم نہ رہ سکتا۔ ہمارے رسول نے لڑکی کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کیا، اور بتایا کہ تم کس خیالِ خام میں مبتلا ہو۔ قوم کا معاشی نظام قائم رکھنے کے لیے لڑکیاں بھی اتنی ہی ضروری ہیں جتنے لڑکے، اسلام آیا، دختر کشی کی رسم بند ہوئی، ملک کی آبادی دن دونی رات چوگنی ہوتی گئی، اور وہ عرب جو ٹکڑوں کو ترستے تھے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہو گئے، گویا عملاً عربوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ روزی کا سوال BIRTH CONTROL (ضبطِ تولید) یا قتلِ اولاد سے حل نہیں ہوتا، بلکہ فطرت کا قانون "طلب و رسد" ہے، جس چیز کی طلب بڑھتی ہے اس کے ذرائع بھی بڑھتے جاتے ہیں، نسلِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے خورد و نوش کے سامان بھی مہیا ہو جاتے ہیں، اور فطرت "انسانی آبادی" اور "ضروریاتِ زندگی" میں خود ہی توازن پیدا کرتی رہتی ہے، اگر ہم عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے کہ فطرت کے ترکش میں غذا اور آبادی کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لیے کیسے کیسے تیر موجود ہیں۔

نمونہ چھوڑ گئے، اپنے حقیقی ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے اور انکی
خدمت کرنے کا تو حضور صلعم کو کافی موقع ہی نہ ملا، ہاں عبدالمطلب اور ابوطالب
جیسے قائم مقام باپ اور حلیمہ اور فاطمہ بنت اسد جیسی قائم مقام ماؤں کے
ساتھ حضور کا حسن سلوک آج تک صفحات تاریخ کی زینت ہے، ایک منصف مزاج، بر،
عادل اور منتظم شہنشاہ، سلیقہ شعار جنرل، بہادر جانباز اور محنت کش سپاہی کی
حیثیت میں بھی حضور صلعم نے جو کار نمایاں فرمائے ہیں وہ ارباب بصیرت پر
پوشیدہ نہیں ہیں مگر آج کی صحبت میں، ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ آخر
رسول اسلام کی تعلیم کا کوئی اثر بھی نمایاں ہوا یا نہیں؟ اور وہ لوگ جو شب و
روز اُن کے گرداگرد رہتے تھے اُن کے اسوۂ حسنہ سے کچھ فیض اُٹھا سکے یا نہیں؟
ظاہر ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے THE TREE IS KNOWN
BY ITS FRIUTS. تاریخی حقائق کی مدد سے ہمیں پتہ لگانا چاہیئے
کہ آیا رسول کی مکمل تعلیم اور اُن کا مقدس طرز زندگی دُنیا میں کوئی ایسا انسان
پیدا کر سکا جو ان کے بعد بنی آدم کے لیے آئیڈیل (قابل تقلید انسان) ہو
یوں تو حضور کے فیض صحبت نے ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا، اور
وہ عرب جو آپ سے قبل بداعمالی کا مسکن بنا ہوا تھا، آپ کی بدولت زر خیز ارضی
بن گیا، مگر آپ کی سیرت کا مکمل نمونہ صرف وہی لوگ بن سکتے تھے جو ہمہ وقت
آپ کی صحبت میں حاضر تھے، جس طرح ہر ایک نقاش کو ایک ماڈل بنانے کی

فکر رہتی ہے اور ہر ایک صناع ایک نمونہ تیار کرتا ہے، اسی طرح دنیا کے اس سب سے بڑے مصلح کی بھی یہ تمنا تھی کہ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ایک ایسا زبردست نمونہ پیش کر دے جو اس کی زندگی میں اور اُس کی زندگی کے بعد دُنیا کے لیے اُس حقیقت کا عملی اظہار کرتا رہے کہ رسولِ اسلام کی تعلیم نامکمل نہیں ہے، بالآخر رسول اللہ کی متجسس نگاہوں نے فاطمہؑ بنت اسد کی آغوش میں اس گوہرِ مقصود کو پا ہی لیا، وہ آنکھیں جو تین شبانہ روز خدا کے گھر میں بند رہیں ٹھیک وقت پر کھلیں، اور خدا جانے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا راز و نیاز ہو گئے کہ رسول اللہ کے مُنہ سے نکل ہی گیا یَا عَلِیُّ خَصَصْتَنِیْ بِالنَّظَرِ وَخَصَصْتُکَ بِالْعِلْمِ دنیا میں یہ علیؑ اور محمدؐ کی پہلی ملاقات تھی، علیؑ رسول اللہ کے ہاتھوں پر پلے، لڑکپن کے آزاد اور بے فکرے دن بھی اس مقدس ہستی کی صحبت میں گزرے، شباب کا زمانہ بھی وہیں بسرا، اور یہ ساتھ اُس وقت تک نہ چھوٹا جب تک علیؑ نے اپنے نامور اُستاد، محسن خسر اور مہربان ابن عم کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک نہ کر دیا، دُنیا کا کوئی دوسرا انسان رسول اللہ کی صحبت میں اس قدر عرصہ تک نہیں رہا، آئیے ہم علیؑ کی سیرت پر ایک نگاہ ڈالیں اگر ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ کا یہ نامور شاگرد دنیا کے لیے فی الواقع ایک قابلِ تقلید رہنما تھا تو ہم سمجھ لیں گے کہ رسول اللہ کی تعلیم مکمل تھی اور اُس میں انسان کو صفاتِ حسنہ کا حامل بنانے کی قوت موجود تھی۔

علیؑ کی سیرت نگاری کا فرض ادا کرنا بیحد مشکل ہے، کیونکہ اُن کی ذات سچ مچ دُنیا میں سب سے نرالی ہے، وہ صفات متضادہ کے حامل تھے، کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ وہ شخص جو ایک دن مرحب اور عمرو ابن عبدود جیسے سُورماؤں کو ناک چنے چبادے، دوسرے دن رسن بستہ حاکم وقت کے سامنے حاضر ہونے میں تامل نہ کرے، وہ جو مظلوموں کی حمایت میں جان تک دینے کو تیار ہو جائے، اپنے حقوق کی پامالی پر اُف تک نہ کرے، غور سے دیکھو! تو علیؑ رسُول اللہ کے حسنِ تربیت کے بہترین ثمر تھے، ان کی زندگی کے ہر ہر حصے سے رسُول اللہ کی شان ٹپکتی ہے، اور ان کی ہر نقل و حرکت سے اسلامی تعلیم کی خوبیاں عیاں ہو رہی ہیں، اسلام ایک صلح اور اطمینان کا پیغام ہے، خود غرضی، جاہ پرستی اور سرمایہ داری سے اسکو ذرا بھی تعلق نہیں، اسکی صحیح تبلیغ تلوار کے زور سے نہیں بلکہ زبان اور عملی نمونوں سے کی جا سکتی تھی، رسُول کریم کی وفات کے بعد علی کی وہ تلوار جس نے خیبر اور بدر میں ہنگامے برپا کر دیے تھے زنگ آلود نہیں ہو گئی تھی، لیکن سچ یہ ہے کہ علیؑ اپنے مقدس اصُول کو تلوار کے زور سے پھیلانا نہیں چاہتے تھے، علیؑ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جھٹ پٹ ابو سفیان کے اُس مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتا جو انھوں نے رسول کریم کی وفات کے چند دن بعد اُن کے سامنے پیش کیا تھا:-

"اے علیؑ آپ اُٹھیں تو ابھی میں مدینہ کی گلیوں کو سواروں

اور پیادوں سے بھر دونگا۔"

ابوسفیان کی ہنگامہ پسند طبیعت کا یہ جادو اگر چل گیا ہوتا تو آج اسلام کا نام تاریخ کے صفحات پر بھی مشکل سے نظر آتا، بیشک علی جانتے تھے کہ ان کے جائز حقوق سے روگردانی کی گئی ہے، انھیں معلوم تھا کہ ہمارے حلیف ہم کو شکست دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، مگر وہ وحدتِ ملت پر جان دیتے تھے، وہ اتحادِ اسلامی پر مرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ہمارے اصول کی صداقت ایک ایک دن ضرور دنیا پر ظاہر ہو کر رہے گی، آزمائش اور ابتلا کی یہ کٹھن گھڑیاں ہمیشہ نہ رہیں گی، کفر کو چند دن اور اسلامی لباس میں رہنے دو کہ بعد کے اسی رنگ میں حق کو پالیں گے، حالات اور واقعات کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس وقت علیؑ کی پیشقدمی اسلام کی خودکشی کی مرادف تھی، وہ طبیعتیں جو ہنوز کسی لالچ سے اسلامی لباس میں پوشیدہ تھیں، ایک دم عریاں ہو جاتیں، اور پھر کھلم کھلا کفر و ایمان کا مقابلہ ہونے لگتا، جس سے ملتِ اسلامی جو ہنوز طفلی کے منازل سے گزر رہی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منتشر ہو جاتی، علیؑ کا دُور رس تدبر اس موقع پر کام آگیا، اور اُن کی خاموشی نے کم از کم ظاہری اسلام کو ترقی پذیر ہونے میں مدد دی، اور وہ قوتیں جو باہمی خانہ جنگی میں مصروفِ عمل ہو جاتیں

دوسرے ممالک کی طرف متوجہ ہوگئیں، اگر سیاست اس مہذب جھوٹ اور شریفانہ مکاری کا نام ہے جو آجکل مغربی ملکوں کا شعار ہے تو ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ علیؑ سیاست داں نہیں تھے، اور اگر سیاست دانی جہانبانی کے اُن مقدس اصول کو کہتے ہیں جو ملک کے امن و امان کے ضامن ہیں تو یہ ایک امر ہے کہ عرب کے مشہور مدبر عمر فاروق تک نے علیؑ کی سیاست دانی کی دو ایک دفعہ نہیں بلکہ سیکڑوں مرتبہ داد دی ہے (لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ) اور یہ ایک تاریخی شہادت ہے کہ اُمورِ سلطنت میں جب کوئی دقت پیش آتی تھی تو حکومتِ وقت کو علیؑ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا،

لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ کے دورِ حکومت میں کوئی ملک فتح نہیں ہوا، آہ! اُن کو یہ خبر نہیں کہ امن پسند مخلوق پر حملہ کرنا دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے؟ اسلام ذہنی، روحانی اور عقلی فتوحات کے لیے دنیا میں آیا تھا، ورنہ مادی فتوحات کے لیے سکندر، ہلاکو، چنگیز اور تیمور کیا کم تھے، اگر علیؑ کے دورِ حکومت میں کوئی ملک فتح ہوتا تو ہم تعجب کرتے، کیونکہ علیؑ عالم کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے آئے تھے، وہ معلم اخلاق تھے، مصلح تھے، ریفارمر تھے، اُن سے اور خونریزیوں سے کیا نسبت، ہاں جب حالات نے مجبور کر دیا تو امن عامہ کی خاطر مدافعانہ طور پر علی کو میدانِ جنگ گرم کرنا پڑا، اور وہاں بھی ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کچھ کم جوہر نہیں دکھائے، عرب لوگ مدت سے

جسمانی طاقت پر نازاں تھے اور اُن کے نزدیک کسی انسان کا سب سے بڑا کمال اُس کی جسمانی طاقت ہی تھی، حالات سے مجبور ہو کر میدانِ جنگ میں علیؑ نے جو زبردست کمال دکھائے وہ زبان زدِ عوام ہو گئے، اور ان علمی عقلی اور ذہنی فتوحات کی طرف لوگوں نے کم توجہ کی جن کے لیے علیؑ دنیا میں آئے تھے علیؑ کے "صحیفۂ حیات" کا یہ باب ابھی تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے، وہ وقت آ رہا ہے جب لوگ دیکھیں گے کہ اسلام کا یہ زبردست فلسفی جرنیل ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایسا عظیم الشان عالم بھی تھا کہ اُسکے فیض نے تمام عرب کو جہالت سے نکال کر علمی دولت سے مالامال کر دیا، لوگوں کو نام نہاد اسلامی بادشاہوں پر ناز ہے تو ہوا کرے، اگر علیؑ نے ملکی فتوحات کے سلسلے میں کچھ نہ کیا تو کیا ہوا، ارے ملک فتح کرنا کوئی[1] دشوار بات ہی نہیں، ہر قوم اور ہر مذہب ایسے بادشاہوں کی فہرست پیش کر سکتا ہے جنھوں نے اپنی تلوار سے ہزاروں کو غلام بنا لیا ہو، مگر بنی آدم کو جہالت کی

---

[1] اس کتاب میں بار بار اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسلام نہ تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کا پنتھ ہے، نہ بزدلوں اور نامردوں کا مذہب، وہ یقیناً یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم کیا جائے، اور اصولِ خیر کو صلح و آشتی کے ساتھ پھیلایا جائے، اس جب اسی اصولِ خیر کی تبلیغ میں کوئی قوم تلوار اُٹھا کر رکاوٹ پیدا کرے اور اسلام کے سیلاب کو آگے بڑھنے سے روکے تو اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے، آلِ محمدؐ نے زندان کی تاریک کوٹھریوں اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں سے تبلیغ اسلام کر کے یہ ثابت کر دیا کہ مذہب کی اشاعت فوج و لشکر اور مال و دولت کی محتاج نہیں ہے بلکہ لب کشائی کے بغیر صرف عملی نمونہ پیش کرنے سے بھی اشاعت دین ہو سکتی ہے، اور اس کا اثر زبانی تبلیغ سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

تاریکیوں سے نجات دینے والے انسان، غلاموں کو آزاد کرنے والے بزرگ، دُنیا کو حریت اور مساوات کا سبق پڑھانے والے مصلح رُوز نہیں پیدا ہوا کرتے، اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ علیؑ اور اولاد علیؑ نے دُنیا کے سامنے جو اُسوۂ حسنہ پیش کیا اُس کی مثال عالم کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا، یہ رسُولِ کریم کی تعلیم ہی کا اثر تھا کہ سنہ ۱۱ھ سے سنہ ۲۶۰ھ تک زبردست رہنماؤں[1] کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ چلتا رہا، اور ان میں سے ہر ایک بزرگ اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑا زاہد تھا، تاریخ کے صفحات اور دوست و دشمن کی تحریریں اس دعوے کی شاہد ہیں۔

---

[1] ائمہ اہلبیت کسی تعارف کے محتاج نہیں، پھر بھی ایک نقشہ حاضر کئے دیتا ہوں جس سے ان حضرات کے سن ولادت و وفات کا پتہ لگ سکے۔

نمبر	اسم گرامی	تاریخ ولادت	تاریخ شہادت
۱	حضرت علی علیہ السلام	۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل	۲۱ رمضان سنہ ۴۰ ہجری
۲	حضرت امام حسن علیہ السلام	۱۵ رمضان سنہ ۳ھ	۲۸ صفر سنہ ۵۰ ہجری
۳	حضرت امام حسین علیہ السلام	۳ شعبان سنہ ۴ھ	۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ
۴	حضرت امام زین العابدین علیہ السلام	۵ شعبان سنہ ۳۸ھ	۱۲ محرم سنہ ۹۵ھ
۵	حضرت امام محمد باقر علیہ السلام	۳ صفر سنہ ۵۷ھ	۷ ذالحجہ سنہ ۱۱۴ھ
۶	حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام	۱۷ ربیع الاول سنہ ۸۳ھ	۱۵ رجب سنہ ۱۴۸ھ
۷	حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام	۷ صفر سنہ ۱۲۸ھ	۲۵ رجب سنہ ۱۸۳ھ
۸	حضرت امام علی رضا علیہ السلام	۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۴۸ھ	۲۳ ذیقعدہ سنہ ۲۰۳ھ
۹	حضرت امام محمد تقی علیہ السلام	۱۵ رمضان سنہ ۱۹۵ھ	۱۱ ذیقعدہ سنہ ۲۲۰ھ
۱۰	حضرت امام علی نقی علیہ السلام	۲۶ ذالحجہ سنہ ۲۱۲ھ	۳ رجب سنہ ۲۵۴ھ
۱۱	حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام	۱۰ ربیع الثانی سنہ ۲۳۲ھ	۸ ربیع الاول سنہ ۲۶۰ھ
۱۲	حضرت امام محمد مہدی علیہ السلام	۱۵ شعبان سنہ ۲۵۵ھ	سنہ ۳۲۹ھ میں غیبت کبریٰ

کیا کوئی دوسرا مذہب اپنے نبی کی تعلیم کا اس قدر دیرپا اثر ثابت کر سکتا ہے، دو سو سال تک ایک ایسے سلسلے کا چلنا جس کا ہر ہر فرد اپنے بانیٔ سلسلہ کا مکمل نمونہ ہو تاریخ عالم میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

علیؑ رسول اللہ پر اُس وقت ایمان لائے[1] جب اُن پر کوئی ایمان لانے والا نہ تھا، انھوں نے اُس زمانے میں اُن کے ساتھ نماز پڑھی جب نیا اذان کی

---

[1] سیرت ابن ہشام میں ہے:—

وكان اول ذكر من الناس آمن برسول الله صلعم وصلى وصدق بما جاءه من الله تعالى علي بن ابي طالب عليه السلام وهو ابن عشر سنين يومئذ وكان مما انعم الله على علي بن ابي طالب انه كان في حجر رسول الله صلعم قبل الاسلام

مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ رسول خدا صلعم پر ایمان لائے اور نماز پڑھی اور جو کچھ رسول اللہ خدا کی طرف سے پیام لاتے تھے اس کی تصدیق فرمائی۔ اُس وقت حضرت علیؑ کی عمر دس سال کی تھی، منجملہ اُن نعمتوں کے جو خدا نے علیؑ کو عطا فرمائیں ایک یہ بھی ہے کہ وہ (قبل اسلام) سے پہلے ہی رسول اللہ صلعم کی آغوش تربیت میں تھے۔

محدث نسائی نے اپنی کتاب خصائص میں لکھا ہے:—

عن عفيف قال جئت في الجاهلية الى مكة وانا اريد ان ابتاع لاهلي من ثيابها وعطرها فاتيت العباس بن عبد المطلب وكان رجلا تاجرا فانا عنده جالس حيث انظر الى الكعبة وقد حلقت الشمس في السماء فارتفعت و ذهبت اذ جاء شاب فرمى ببصره الى السماء ثم قام مستقبل الكعبة ثم لم البث الا يسيرا حتى جاء غلام فقام على يمينه

عفیف سے روایت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں، میں اپنے اہل و عیال کے لیے کپڑے اور عطر خریدنے کے لیے مکے آیا، چونکہ عباس بن عبدالمطلب تجارت پیشہ تھے میں اُن کے پاس گیا، آفتاب بلند ہو کر ڈھل گیا تھا اور میں اُن کے پاس بیٹھا ہوا کعبہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ناگہاں میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور آسمان کی جانب نظر کر کے وہ قبلہ کھڑا ہو گیا، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک لڑکا آیا اور اُس جوان کی داہنی طرف کھڑا ہو گیا۔ ...

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

آواز سے آشنا نہ ہوئی تھی اور ان کے سوا کوئی دوسرا نماز پڑھنے والا نہ تھا، وہ اُس وقت اُن کے کام آئے جب کوئی دوسرا اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا، بدر، اُحد، خندق اور خیبر کے میدان علیؑ کی رفاقت اور جاں نثاری کی شہادت دے رہے ہیں، وہ علیؑ جس کو رسولؐ اللہ نے اپنے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ثم لم البث الا يسيرا حتى جاءت امرأة فقامت خلفهما فركع الشاب فركع الغلام والمرأة فرفع الشاب فرفع الغلام والمرءة فسجد الشاب فسجد الغلام والمرأة فقلت يا عباس امر عظيم قال العباس امر عظيم اتدري من هذا الشاب قلت لا قال هذا محمد بن عبد الله ابن اخي اتدري من هذا الغلام هذا علي ابن اخي اتدري من هذه المرأة هذه خديجة بنت خويلد زوجته ان ابن اخي هذا اخبرني ان ربه رب السماء والارض امره بهذا الدين الذي هو عليه ولا والله ما على الارض كلها احد على هذا الدين غير هؤلاء الثلاثة

پھر ایک عورت آئی جو ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ جوان نے رکوع کیا اُس کے ساتھ لڑکے اور عورت نے بھی رکوع کیا، جب اس جوان نے رکوع سے سر اُٹھایا تو لڑکے اور عورت نے بھی سر اُٹھایا، جب اس جوان نے سجدہ کیا تو اُس کے ساتھ لڑکے اور عورت نے بھی سجدہ کیا، میں نے عباس سے کہا یہ تو بڑا (عجیب) واقعہ ہے۔ انھوں نے کہا، ہاں ہو تو ایسا ہی، کیا تم اس جوان، لڑکے اور عورت کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ عباس بولے یہ جوان میرا بھتیجا محمد بن عبداللہ ہے، یہ لڑکا میرا بھتیجا علی ابن ابیطالب ہے، اور یہ عورت خدیجہ بنت خویلد اس جوان کی زوجہ ہے، میرے اس بھتیجے نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا خدا زمین و آسمان کا رب ہے۔ اسی نے مجھے اس دین کا حکم دیا ہے، جس پر میں ہوں، اے عفیف! خدا کی قسم اس دین پر اس وقت ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

انھی محدث نسائی نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ :-

ما اعرف احدا من هذه الامة عبد الله بعد نبينا غيري. عبدت الله قبل ان يعبده احد من هذه الامة تسع سنين

میں اس اُمت میں اپنے سوا کسی کو ایسا نہیں پاتا جس نے رسولِ مقبول کے (بعد و سلے پہلے) خدا کی عبادت کی ہو میں نے کل اُمت کے سے نو برس پہلے پروردگارِ عالم کی عبادت کی ہے۔

ہاتھوں پر پالا تھا، اُس وقت تک الگ نہیں ہوا جب تک اپنے ہاتھوں سے اُس مقدس رسول کی نعش کو قبر میں نہ رکھ دیا صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہ۔

علیؑ کی مقدس زندگی پر پوری روشنی ڈالنا مشکل ہے، وہ اپنے وقت کے زبردست فلسفی، اعلیٰ درجہ کے بہادر، لیبر تحریک کے حامی، اور خود دُنیا کے سب سے بڑے مزدور تھے، دُنیا کا کوئی خزانہ کوئی فنڈ اُن کے اخراجات کا کفیل نہ تھا، وہ قوم اور مذہب کی خدمت بھی کرتے تھے اور اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مزدوری بھی، وہ چندہ وصول کرنا اور خیرات پر گزر اوقات فرمانا انسانیت کی توہین سمجھتے تھے، ہر چند کہ آمدنی محدود تھی، مگر پھر بھی سیکڑوں محتاجوں کی حاجت روائی فرماتے تھے...

...... لوگوں نے فاطمہ کے بچوں کو فاقوں سے مرتا ہوا دیکھا، مگر کسی نے یہ نہ سُنا کہ علیؑ کے گھر پر آ کر کوئی سائل خالی ہاتھ لوٹ گیا ہو، جس گھر میں ایک چکی اور ایک کھال کے سوا (جس پر دن کو اونٹ چارہ کھاتا اور رات کو سیدۂ عالم استراحت فرماتی تھیں،) کوئی اور سامان نہ تھا، اُس کے دروازے پر دُنیا بھر کے فقیروں کی حاجت روائی ہوتی تھی، اور اُس کے اندر مساوات اور تقسیم عمل کا عملی سبق دیا جاتا تھا کہ ایک دن سیدہ گھر کا کام کرتی تھیں اور دوسرے دن فضہ جو در اصل کنیز نہ تھیں بلکہ شریک عمل اور رفیق کار تھیں، اور لباس و طعام میں فاطمہؑ کے برابر نہیں بلکہ اُن سے بڑھ چڑھ کر رہتی تھیں۔

فضہ کی چادر میں بہتر پیوند تھے' فضہ کے پاس ایسی ردا نہ تھی کہ جس کے سر پر ڈالنے سے تن عریاں ہو جاتا تھا' اور تن پر ڈالنے سے سر عریاں ہو جاتا تھا' اے سیدہؑ! تیرے ان ہاتھوں کا ذکر جو چکی پیستے پیستے زخمی ہو جاتے تھے' لیبر تحریک کے حامی سن لیں تو تیرے نام کی پرستش کرنے لگیں۔

علیؑ کے تبلیغی خدمات عالم آشکارا ہیں' وہ تبلیغی[1] مشن جو یمن کی طرف روانہ کیا گیا تھا' علیؑ ہی کی بدولت اشاعتِ اسلام میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر کے واپس آیا' ورنہ ایک دوسرے عرب سردار نے اپنی مارشل اسپرٹ (جنگی ولولہ) کا بیجا اظہار کر کے اس ہمسایہ ملک کو دشمن بنا لیا تھا' علیؑ خود بھی تحقیق و تدقیق کے دلدادہ تھے' اور دوسروں کو بھی اس مفید شغل کی طرف

---

[1] تاریخ طبری کے فاضل مصنف نے اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:—

فی ہذہ السنۃ بعث رسول اللہ صلعم علیا الی الیمن وقد کان ارسل قبلہ خالد بن الولید الیہم یدعوہم الی الاسلام فلم یجیبوہ فارسل علیا وامرہ ان یقفل خالدا ومن شاء من اصحابہ ففعل وقرأ کتاب رسول اللہ علی اہل الیمن فاسلمت ہمدان کلہا فی یوم واحد

(اسی سال (یعنی سنہ ۱۰ھ میں) رسول خدا نے حضرت علیؑ کو یمن روانہ فرمایا' ان سے قبل خالد بن ولید کو روانہ کیا تھا کہ اہل یمن کو اسلام کی دعوت دیں مگر کسی نے اسلام قبول نہ کیا' اب رسول خدا نے علیؑ کو روانہ فرمایا' اور حکم دیا کہ خالد اور ان کے ساتھیوں میں سے جس کو چاہیں معزول کریں چنانچہ علیؑ مرتضیٰ نے ایسا ہی کیا' اور جا کر اہل یمن کو رسول کا فرمان سنایا' نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی دن میں سارا قبیلۂ ہمدان اسلام لے آیا۔

متوجہ فرماتے رہتے تھے، سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ[1] ہمیشہ اُنکی زبان پر رہتا تھا، انھوں نے صفین اور جمل کے اُن خطرناک موقعوں پر بھی جب تلواریں چل رہی تھیں، تیر برس رہے تھے اور خون پانی کی طرح بہایا جارہا تھا لوگوں کے سوالات کا جواب دیا اور ایک بار توحید باری کے اس نازک مسئلے پر بصیرت افروز روشنی ڈالی جو اسلامی الہیات کا سب سے مشکل مسئلہ ہے، غرض امیر المومنینؑ کی جسمانی اور دماغی دونوں قوتوں نے اسلام کی تبلیغ میں مدد دی، یاد رکھنا چاہیے کہ تسخیر ممالک اور فتوحاتِ بلاد کا حریصانہ مقصد علیؑ کے پیش نظر نہیں تھا، وہ سرمایہ پرست اور استبداد پسند انسانوں کی طرح کسی قوم کی آزادی کو سلب کرنا نہیں چاہتے تھے، اسلام کی مذہبانہ جنگوں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے، مگر جب حریص طبیعتوں نے دین کو جاہانہ کارروائیوں کا مرکز بنا دیا تو وہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئے، ایک مرتبہ جب خلافتِ ثانیہ میں سپہ سالاری کا اہم عہدہ آپکے سامنے پیش کیا گیا تو آپنے اُسے نامنظور کر کے یہ بتادیا کہ ایک حقیقی مصلح ملک گیری اور فوج کشی کے ناجائز وسائل میں معاون نہیں بن سکتا، بہادروں کی بیچل طبیعت رُکا نہیں کرتی، مگر فاتح خیبر و بدر کا مدتوں تک خاموش رہنا اور مسلمانوں کے نام نہاد جہادوں میں شرکت نہ کرنا اپنے پہلو میں ایک زبردست راز

[1] مجکو گم کر دینے سے پہلے مجھ سے سوالات کرتے رہو۔

چھپائے ہوئے ہے، دُنیا میں صرف ایک ہی طبقہ ہے جو اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اُس نے اور اُسکے رہنماؤں نے مُلک گیری، ہوسِ جاہ، اور شوقِ دولت کے لئے کبھی تلوار نہیں اُٹھائی، فلسفۂ آلِ محمد کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُس کے ماننے والوں کے ہاتھ بنی نوعِ انسان کے خونِ ناحق سے رنگین نہیں ہیں، ان کے نامۂ اعمال میں بیجا تفاخر، ناجائز اقتدار اور سرمایہ داری کا کوئی الزام نہیں ہے، انھوں نے دین کو نہ تو کبھی حصولِ ثروت کا ذریعہ بنایا نہ اس کی تبلیغ میں جبر و اکراہ کو دخل دیا،

آلِ محمدؐ کا ذکر قلوب کے لیے روحانی غذا ہے، ان کی زندگی دُنیا کے لیئے ایک معجزہ تھی، وہ تاریک قیدخانوں میں رہ کر بھی فرائضِ تبلیغ سے غافل نہیں رہے، اور آج گو وہ نظروں سے پوشیدہ ہیں مگر اُن کا روحانی تصرف ہماری رہنمائی کر رہا ہے، اور تبلیغ کے وہ زبردست کارنامے جو مادہ پرست لوگوں کو محوِ حیرت بنا دیتے ہیں اب تک ان کے پوشیدہ اثرات کے رہینِ منت ہیں، اولادِ علیؑ کے مشاہدِ مقدسہ اور امام حسینؑ کے سامانِ عزا کے ذریعے جسقدر تبلیغ ہوتی ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی دوسرے ذرائع سے ممکن نہیں، مسلمانوں میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی عظمت و شان سے واقف نہیں، اور صرف لوگوں کی دیکھا دیکھی شاہانِ اسلام کا دم بھرنے لگے ہیں، آہ! انھیں خبر نہیں کہ جب تاج و تخت کے مالک

مشکلات میں مبتلا ہوتے تھے تو ان کو حل کرنے کے لیے قید خانوں[1] کے دروازے کھولے جاتے تھے اور پا بہ زنجیر رہنمایانِ دین حکومتِ وقت کو مشورہ دینے کے لیے بلائے جاتے تھے، آہ! وہ دماغ جو اصلاحِ ملت کے لیے بنائے گئے تھے قید خانوں کی چار دیواری میں نظر بند ہو کر رہ گئے، اور وہ ہاتھ جو مظلوموں کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے رسن بستہ ہوتے رہے، وہ سینے جن میں علوم و فنون کا ایک خزانہ بھرا ہوا تھا، تیروں سے چھلنی کیے گئے۔ اور وہ زبانیں جو حق گوئی کے لیے پیدا ہوئی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئیں، اور گو آلِ محمدؐ کی روحانی تبلیغ کو روکنے کے لیے تمام سامان مہیا کیے گئے مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ معرفت اور حقیقت کا یہ سیلاب رُک نہ سکا، تاجدارانِ بنی اُمیہ خاک میں مل گئے، بنی عباس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر آلِ محمدؐ آج بھی دلوں پر حکومت کر رہی ہے اور دنیا جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے ان کے فلسفہ کی قدر دانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کارل مارکس، ٹالسٹائی اور لینن کی کتابیں پڑھیئے تو معلوم ہو کہ آلِ محمد کے سادہ قوانینِ زندگی نے کس قدر مقبولیت حاصل کی ہے، میرے دوست مسٹر بنام رائے ام اے سابق اڈیٹر "سوراجیہ" لاہور آلِ محمد کی سیرت کا مطالعہ کریں تو انہیں پتہ چلے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو دنیا

---

[1] امام حسن عسکری علیہ السلام اور بغداد کا قحط مشہور خاص و عام ہے۔

کے امن وامان کا ضامن ہو سکتا ہے، دہریت خواہ دیکھنے میں کتنی ہی دل فریب کیوں نہ ہو، مگر انسانیت کی بڑھتی ہوئی حرص و آز پر خیال کرتے ہوئے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ مذہب کے قیود سے آزاد ہو کر انسان ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کر سکیں گے؟ مادہ پرست یورپ نے برسوں دہریت کے "خیالی فردوس" میں زندگی بسر کی اور دیکھ لیا کہ اقتصادی، تمدنی اور تجارتی مشکلات کا حل دہریت کے ذریعہ سے ممکن نہیں جب تک ہم روحانیت کی طرف نہ لوٹیں گے، اور ایک مکمل مذہب کے پابند ہو کر نہ رہیں گے، اُس وقت تک دنیا آئے دن ایسی ہی ہولناک اور مہیب جنگوں میں مبتلا رہے گی جیسی ہم کل پرسوں دیکھ چکے ہیں، مذہب تمدن کی جان ہو اگر دنیا سے مذہب گیا تو تمدن بھی گیا، اور تمدن گیا تو پھر انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی آزادیاں غائب ہو گئیں جب تک ہمارے دل پر ایک خدا کا جو جزا اور سزا کا مالک ہے اثر رہیگا ہم حقوق عباد کی رعایت کرتے رہیں گے اور جب خدا سے منہ موڑا تو زبان اور دل میں دوئی پیدا ہوئی، ہم کہیں گے کچھ اور عمل ہمارا کچھ اور ہوگا، اور اگر ہم سوسائٹی کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو سکیں تو بُرے سے بُرا کام بھی کرنے سے نہ چوکیں گے، اقبال صاحب کہتے ہیں ؎

بادِ نسیم رُک بھی شوق سے تار تار بھی   رہنے دو تم منہ پہ تم خشک کلیاں بھی

ابنِ ملجم کی تلوار میں توحید کا ایک سبق پوشیدہ تھا

مسجدِ کوفہ میں ایک محسنِ انسانیت کی شہادت

مسیح ناصری کی امن آفریں تعلیم فنا ہو چکی تھی، گرجاؤں اور کلیساؤں میں احکم الحاکمین کی عبادت کے بجائے فطرسؑ، پولسؑ اور مریم کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی، رومی خانقاہیں انسانیت سوز جرائم کا مرکز بنی ہوئی تھیں، پوپ جو مسیح کا نائب اور ساری عیسائی دُنیا کا پیشوا کہلاتا تھا امنِ عامہ کے لئے بلائے بے درماں تھا، مریم کی یاد میں رہنے والی دوشیزہ خواتین اور مسیح کی پیروی کرنے والے کنوارے پادری مذہب کے پیردوں میں کرکشاستر کا ڈرامہ کر رہے تھے، یہودی قومی اور نسلی امتیازات کا بے سُرا راگ آلاپ رہے تھے، خدا کا وہ مقدس

لہ حضرت عیسیٰؑ کے ایک حواری۔

لہ عیسائی مذہب کے ایک بڑے رکن جن کی سعی سے یہ دین پھیلا۔

پیام جو موسیٰ کی معرفت دُنیا میں آیا تھا، حریص راہبوں نے طالمود کے قصّوں اور کہانیوں سے بدل رکھا تھا، کوہِ طور پر اندھیرا تھا، زیتون کے پہاڑ پر خاموشی تھی، یروشلم اجنبیوں کے ہاتھوں میں تھا، بیت المقدس کی ویرانی حد سے گزر گئی تھی، بابل اور نینوا کی پُرانی تہذیبیں مدفونِ خاک ہو چکی تھیں، ایران میں آتشکدے روشن تھے، مگر عشقِ الٰہی کی آگ بُجھ چکی تھی، ہندوستان میں خُدا کی مخلوق قوموں اور قبیلوں میں منقسم تھی، برہمنوں[1] کے جابرانہ اور تمدن کش قوانین نے مُلک کی ترقی روک دی تھی، بے بس اور بے کس شودر کی آہِ "نیم شب" ملائکہ تک میں ہیجان پیدا کر دیتی تھی، یونان برسوں کی لگاتار جدوجہد کے بعد خوابِ گراں کے مزے لوٹ رہا تھا، کوہِ اولمپس[2] کے دیوتا اُس کو جگانے سے معذور تھے، ڈیلفی[3] کے غار سے بھی اصلاحِ ملت کی کوئی خبر نہیں ملتی تھی، یورپ گمنامیوں کی تاریکی میں پڑا ہوا تھا، تمام قوموں کی نگاہیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں، نظامِ مجلسی (سوسائٹی) کی خرابیوں کا بڑھتا ہوا سیلاب دُنیا کو غرق کرنے کی دھمکی دے رہا تھا کہ یکا یک فاران

---

[1] ہندو قوم میں چار ذاتیں ہیں، برہمن۔ چھتری۔ ویش۔ شودر، ان میں سے شودر ہزاروں سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا ہوا ہے۔

[2] OLYMPUS یونان کا وہ پہاڑ جس کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ اس کی چوٹی پر دیوتا بیٹھتے ہیں

[3] DELPHI یونان میں اپولو دیوتا کے مندر میں ایک غار تھا جہاں جا کر قدیم یونانی فال لیتے تھے۔

کی چوٹیوں پر وہ نور چمکا جس نے دُنیا بھر میں اُجالا کر دیا، یونان کے سیکڑوں خداؤں اور ہندوستانیوں کے کروڑوں دیوتاؤں کے مقابلے میں، یہودی تجسیم اور مسیحی تثلیث کے سامنے رسولِ اللہ نے ایک ایسے قادرِ مطلق کا تصوّر پیش کیا جو جسم و جسمانیات سے منزہ ہونے کے باوجود کائنات کے تمام نظام پر حکومت کر رہا ہے، اُنھوں نے بتادیا کہ دریاؤں، سمندروں، جنگلوں، پہاڑوں اور باغوں کے انتظام کے لیے جُدا جُدا خداؤں کی ضرورت نہیں، ابر و باد، آفتاب و ماہتاب، زمین و آسمان ایک ہی قادر و توانا ذات کی مخلوق ہیں، اور وہی اس سارے کارخانۂ وجود پر حکمرانی کر رہا ہے، نہ کوئی سورج بنسی[1] ہے نہ کوئی چندر بنسی، نہ کوئی زیوس[2] کا فرزند ہے نہ MINERVA منروا کا لے پالک، سب اللہ کے بندے ہیں، اور آپس میں برابر ہیں، کوئی شہر روما کا باشندہ ہو، یا کاشی کا ہی، کسی کی رگوں میں عبرانی خون گردش کر رہا ہو یا حبشی، اُس کی سرشت میں خاکِ مکہ ہو یا خاکِ ابی سینیا، اللہ کی نظر میں اُن کے درمیان کوئی بھی امتیاز نہیں، نسلوں اور رنگوں کا تفاوت انسان کے مرتبے میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا، جب ایک ماں کے تمام بچے خواہ وہ کالے ہوں

---

[1] راجپوتوں کے وہ مشہور خاندان جو اپنے آپ کو سورج اور چاند کی اولاد سمجھتے ہیں۔

[2] Zeus یونان کا سب سے بڑا دیوتا، منروا یونان کی ایک دیوی، قدیم دیوتاؤں کے اکثر ہیرو کسی دیوتا کی اولاد یا اُن کے متبنّیٰ ہوتے تھے

یا گورے، اچھے ہوں یا بُرے، افریقہ میں رہتے ہوں یا یورپ میں، آپس میں برابر ہیں تو اور فطرت کے فرزندوں میں رنگ اور روپ اور قومیت اور وطنیت کا تفاوت کیسا؟ لاکھوں اور کروڑوں خداؤں کے اعتقاد نے بنی آدم کو صدہا فرقوں میں تقسیم کر رکھا تھا، جن میں بعض قوت اور طاقت کے بھروسے پر دوسروں کی گردنوں پر سوار تھے، اور عقائد کے اختلاف نے قوموں کے درمیان تفریق و تشتت کی خلیج پیدا کر دی تھی، جو دن بدن وسیع تر ہوتی جاتی تھی، ایرانیوں کے دیوتا الگ تھے، اور رومیوں کے الگ، یونانیوں کے عقائد جدا تھے، اور عربوں کے جُدا، ان تمام قوموں کو ملا کر ایک قوم بنانا قریب قریب محال سا تھا، رسول اللہ نے ایک خدا کا وعظ کر کے دُنیا کو وحدتِ انسانیت کی دعوت دی، عالم کی تاریخ میں یہ سب سے پہلا موقع تھا کہ رومی، روسی، ہندی، ایرانی، کالے، گورے، چھتری، ویش اور شودر کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے بلایا گیا اور ان کے حقوق کو بالکل مساوی کر دیا گیا ہو، ساری دُنیا نسلی تفوّق کی قائل تھی، برہمن صرف اسی لیئے کہ برہمن کے نطفے سے پیدا ہوئے تھے مقدس تھے، چھتری صرف اس لیئے راجہ بنتے تھے کہ ان کی رگوں میں راجپوتی خون تھا، ایک حبشی محض اس لیئے کہ قدرت نے اُسے افریقہ میں پیدا کیا تھا لوگوں کی غلامی کرتا تھا، عرب کے اس

زبردست ریفارمر نے جب ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (الآیۃ)

ان الجنۃ لمن اطاع اللہ ولو کان غلاما حبشیا والنار لمن

عصی اللہ ولو کان سیدا قرشیا (الحدیث) کا کھلم کھلا اعلان کیا تو دُنیا میں

ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل چل مچ گئی، اُس نے صرف زبان

ہی سے غلاموں کی آزادی اور مساوات کا سبق نہیں دیا بلکہ اپنی پھوپھی زاد

بہن کا نکاح زید ابن حارثہ سے کر کے اور اُسامہ ابن زید کو لشکر کا امیر بنا کر

جس میں جلیل القدر صحابہ شامل تھے آنے والی نسلوں کے لیئے یادگار اُسوۂ حسنہ

چھوڑا۔

رسُولِ مقبول کی آمد سے قبل مذہب عقیدوں اور رسموں کا نام تھا،

ایک برہمن جب آرتی کرنے کے لیئے مندر میں جاتا تھا تو وہ سمجھتا تھا

کہ میں دھارمک کام میں مشغول ہوں، ایک یہودی جب اپنے عبادت خانہ

میں "رب الافواج" کی بندگی مقررہ الفاظ میں کرتا تھا اور قربانی کے

گوشت کو آگ میں ڈالتا تھا تب اُسکے مذہبی فرائض پورے ہوتے تھے

رسُول اللہ نے بتایا کہ انسان کا ہر وہ فعل جو وہ اپنے اور سوسائٹی کے

فائدے کے لیئے کرے عبادت ہے، اور انسان عبادت ہی کے لیئے

پیدا ہوا ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ہمارا

کھانا، پینا، کسبِ معاش کرنا سب عبادت ہے، آپنے فرمایا کہ مذہب کوئی

از کم چیز نہیں ہے وہ قانونِ فطرت ہی کا دوسرا نام ہے فاقم
وجهك للدين حنيفا ، فطرت الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله الخ

لوگ دیوتاؤں اور خداؤں کے خوش کرنے کے لئے ان کی بندگی کرتے تھے، اور اُن کی درگاہ میں قربانیاں چڑھاتے تھے، رسُولِ سلام نے اس نظریہ میں تبدیلی پیدا کی اور فرمایا ومن یشکر فانما یشکر لنفسہ الآیۃ
لن ینال اللہ لحومها ولا دماءها ولکن ینالہ التقوی منکم

دُنیا کے تمام مذاہب کا یہ دستور ہے کہ کسی کو اپنے اندر داخل کرتے وقت کچھ رسمیں ادا کرتے ہیں یہاں تک کہ خود اپنے ہم مذہب کے بچّے کو بھی بغیر ان رسموں کے ادا کیئے اپنی برادری کا فرد نہیں سمجھتے، عیسائیوں کو دیکھ لیجئے، جب کسی کو عیسائی بنائیں گے تو اصطباغ کی رسم ادا کرینگے، آریوں کا بھی یہی حال ہے کہ بغیر جنیو پہنائے وہ کسی کو آریہ نہیں بنا سکتے، پھر یہ عمل غیروں ہی کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ اُن کے بچّے بھی ان رسموں کے بغیر مذہب میں داخل نہیں ہو سکتے، یہی حال یہودیوں اور دوسرے مذاہب کا ہے۔ رسولِ سلام نے اس غلط فہمی کا ازالہ فرما دیا، اور صاف طور پر بتا دیا کہ اہلِ مذاہب کی ان رسموں سے ظاہر ہے کہ ان کا دین فطری نہیں ہے، بلکہ اس دُنیا میں آ کر باہر سے سر پر لادا جاتا ہے، اسلام دینِ فطرت ہے:-

کل مولود یولد
ہر بچہ خواہ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہو

على فطرة الاسلام	یا عیسائی کے گھر میں نطفۃً تو وہ مسلمان
ثم ابواه يهودانه	ہی ہوتا ہے بڑا ہو کر اُسکے ماں باپ
او ينصرانه او يمجسانه	جو چاہیں بنالیں۔

اسلیے اسلام میں داخل ہونے کے لیئے کسی رسم کے ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بچہ جس وقت پیدا ہوا وہ مسلمان ہی ہے[1]

رسُول حضرت دُنیا کے فرسودہ عقائد میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے آئے تھے، اُن کا مقصد یہ تھا کہ سوسائٹی میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کو دور کیا جائے، قاعدہ ہے کہ ریفارمر اپنے زمانے میں ہمیشہ ناقدری کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور اُس کی زبردست تخیل کو سمجھنے والے اُس کے زمانے میں موجود نہیں ہوتے، اور حق یہ ہے کہ ریفارمر کی صداقت کا اصلی نشان یہی ہے کہ اُس کے ہمعصر اُس کو پاگل سمجھیں اور مجنوں خیال کریں، مگر رفتہ رفتہ اُس کے زبردست اصول کی صداقت کھلتی جائے اور زمانہ جسقدر ترقی کرتا رہے اُسکے پاکیزہ نظریات مقبول ہوتے رہیں، یہاں تک کہ صدیوں بعد دُنیا والے یہ کہتے نظر آئیں کہ بے شک جو کچھ کہا گیا تھا حرف بحرف سچ تھا

رسُول مقبول اور اُن کے مقدس جانشین علیؑ کو سچ مچ لوگوں نے پاگل،

---

[1] کہا جا سکتا ہو کہ پھر ختنہ کیوں کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہو کہ ختنہ کرانے سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو یہودی بھی مسلمان ہو جاتے کہ اُن کے یہاں بھی ختنے کا رواج ہے، ختنہ تو حفظانِ صحت کے اصول پر مبنی ہے۔ اس عمل سے کوئی مسلمان نہیں بنتا۔

ناعاقبت اندیش، سیاست نا آشنا اور خدا جانے کیا کیا سمجھا، وقت گزرتا گیا
رسول اللہ اور اُن کے جانشینوں کی تعلیم کے خلاف اسلام جہانگیری، سرمایہ داری
اور اقتدار پسندی کا مرکز بنا دیا گیا، تلوار نیام سے نکلی اور مدتوں تک اپنوں اور
پرایوں کا خون بہاتی رہی، استبداد اور جور پسند قسمت آزما برسوں تلوار اور زہر کی
مدد سے دُنیا پر قابض رہے، بحر الکاہل سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور بحر شمالی
سے لیکر جزائر الہند تک نام نہاد اسلامی جھنڈا ہوا میں فراٹے بھرتا رہا، یکے بعد
دیگرے سیکڑوں ملک فتح ہوئے، ہزاروں قوموں کی آزادی میں خلل ڈالا گیا،
سمندروں، گرجاؤں، اور آتشکدوں میں شور مچ گیا مگر بالآخر بیک گردش
چرخ نیلوفری، جب اجنبی طاقتوں نے تلوار مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لی تو یہ معلوم
ہوا کہ اسلام ڈاکوؤں اور رہزنوں کا ایک منصوبہ تھا جو قرون وسطیٰ کی جہالت سے
فائدہ اٹھا کر سیلاب کی طرح بڑھتا رہا، اور طوفان کی طرح مشرق اور مغرب پر
چھا گیا، اس نامور خلیفہ سے لے کر جو مدینہ کے باہر دھوپ میں محو خواب ہوتا
تھا اُس صاحب حشمت سلطان تک جو کوشک یلدیز کی سر بفلک عمارت میں آرام فرما
تھا، مجھے تو ایک بھی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جس نے اپنے ذاتی اقتدار اور ہوس جاہ
و حرص مال کا خیال چھوڑ کر بنی آدم کی سچی خدمت کی ہو، یہ دوسری بات ہے
کہ ذاتی مفاد کے حصول کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے تھے اُن سے کچھ
خلق اللہ کو بھی فائدہ پہونچ گیا ہو۔

سلطانِ دمشق معاویہ اور ان کے رُسوائے زمانہ فرزند یزید کی جاو بیجا

سخاوتیں اسلیے نہیں تھیں کہ وہ مخلوقِ خدا کے دُکھ درد کو مٹانا چاہتے تھے

بلکہ اپنے ذاتی اثر کو بڑھانے کے لیے اشرارِ وقت کی پرورش کرتے تھے،

فلسفۂ یونان کا ترجمہ عربی میں اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کی مدد سے اس فلسفۂ الٰہی

کا مقابلہ کیا جائے جو اہلبیت رسول کا طغرائے امتیاز تھا، اسلام کی اصلی صورت

آپ کو ان مقدس بزرگوں کی زندگی میں ملے گی جو عمر بھر تکلیفوں میں مبتلا رہے،

جو زہر اور تلوار کا شکار بنائے گئے، اور جن کی تبلیغ کو روکنے کے لیے ہر ممکن

کوشش کی گئی، زبانوں اور قلموں پر پہرے لگا دیئے گئے، عامۃ الناس کو اپنی

طرف مائل کرنے کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے، اور جب اس طرح بھی

کام نہ چلا تو مقابلے کے لیے سرکاری اماموں کا تقرر ہوا، عباسیوں کی حکومت

سرکاری اماموں کے تقرر کے لیئے تاریخ میں مشہور ہے ؎

دینِ حق را چار مذہب ساختند   فتنہ در دینِ نبیؐ انداختند

یہ سب کچھ ہوا مگر آلِ محمدؐ کی تعلیم دن بدن اپنا اثر کرتی رہی اور گو ان کے ہمعصر لوگوں

نے ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی مگر آج دُنیا اُن کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے

ان کا فلسفۂ معاشرت جس پر عیش پسند سلاطین انگشت نمائیاں کرتے تھے، انکی

محنت شعاری اور فقرا پروری جس کو لوگ حد سے گزری ہوئی نیکی کہہ کر پکارتے

تھے آج مغربی تہذیب کی ہلاکت آفرینیوں اور تمدن سوزیوں کا واحد علاج

سمجھی جا رہی ہیں۔ کارل مارکس[1]، ٹالسٹائی[2]، لینن[3] وغیرہ متفق اللفظ ہو کر کہہ رہے ہیں کہ امن و امانِ عالم بغیر اس فلسفہ کے ممکن نہیں؟

مدت ہوئی کہ نغمۂ عباسیت خاموش ہے، برسوں گزر گئے کہ بنی امیہ کے سازِ استبداد کی صداؤں سے کان نا آشنا ہیں اور کل ہی پرسوں کی بات ہے کہ خمخانۂ خلافت ترکی میخواروں سے خالی ہوا ہے، بہت سے آئے اور گزر گئے مگر آلِ محمدؐ کا اقتدار اپنے مقام پر قائم ہے، امام جعفر صادقؑ نے خوب فرمایا تھا۔

"یہ سلطنت آنی جانی ہے آج تیرے پاس ہو، کل اس کا مالک کوئی اور ہوگا، مگر ہم روحانیت کے بادشاہ ہیں، دلوں پر حکومت کرتے ہیں، ہمارے اقبال کو زوال نہیں۔"

لوگ امیر المومنین علیؑ اور ان کے جانشینوں پر ہنستے ہیں اور ان کی بیکسی کو ان کی ناکامی سے تعبیر کرتے ہیں، ان کو خبر نہیں کہ یہ دنیا مصلحِ وقت اور مجددِ عصر کے ہمیشہ درپے آزار رہتی ہے، تاریخ کے صفحات کھولیئے اور سقراط کی موت کی دردبھری داستان پڑھیئے، انجیل کو ہاتھ میں لیجیئے اور مسیح ابنِ مریم کی مصیبتوں پر چار آنسو بہائیے، خود رسولِ مقبول کا مشہور قول یاد کیجئے ما اوذی نبی مثل ما اوذیت اور پھر آلِ محمدؐ کی کامیابی پر تنہائی پر غور کیجیے،

---

[1] دورِ جدید میں اشتراکیت کا بادا آدم۔
[2] ایک روسی امیر زادہ مصنف جس نے اشتراکی خیالات کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا ہے۔
[3] انقلابِ روس کا بانی اور روسِ جدید کا پہلا اشتراکی صدر۔

ریفارمر اُس کو کہتے ہیں جو سوسائٹی میں انقلاب پیدا کرنے کے لیئے آئے، جو قوموں کے دلوں میں جمے ہوئے عقائد کے خلاف وعظ کرے، جو ناجائز خواہشات کے بتوں کو پامال کرے، جو سرمایہ داری اور استبداد کو ختم کرنے کا تہیہ کرے، مخلوقِ خدا کو ظالموں کے پنجے سے نکالے، ظاہر ہے کہ ایسا آدمی اپنے وقت میں آرام کی زندگی کس طرح بسر کر سکتا ہے، غور کرو تو معلوم ہو جائے کہ ان مقدس افراد کی مظلومانہ زندگی میں بھی دُنیا کے لیئے ایک سبق تھا، تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے کہ پچھلی اُمتوں نے جب انبیا اور اولیا کی مافوق العادت کرامتیں دیکھیں اور اُن کی بے نظیر عقل و فہم اور اعلیٰ درجے کی تعلیم پر نظر ڈالی تو وہ محوِ حیرت ہو کر رہ گئیں اور ان مقدس بندگانِ خدا پر ان کو خدائی کا دھوکا ہو گیا، لیکن اللہ نے اس اُمت پر یہ فضل فرمایا کہ جتنے بھی ائمہ گزرے کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا رہے اور ہمیشہ دشمنانِ دین کے ظلم و ستم سہتے رہے اور دُنیا نے سمجھ لیا کہ اگر یہ حضرات خدا ہوتے تو اس قدر مظلومیت کے عالم میں زندگی کیوں بسر کرتے۔

رمضان کی اُنیس تاریخ تھی، آسمان پر سحر کی روشنی نمایاں ہو چلی تھی، مسجدِ کوفہ کی قندیلیں کچھ جل رہی تھیں، کچھ خاموش ہو چکی تھیں کہ یکایک ایک آواز بلند ہوئی قد قتل امیر المومنین اور اُس آواز نے اگرچہ دنیائے اسلام میں تہلکہ ڈال دیا، مگر نصیریوں کو معلوم ہو گیا کہ اُن کا خدا ایک شقی ازلی

کی تلوار کا نشانہ بنا، چشم بصیرت ہوتی تو ابن ملجم کی تلوار کا یہ وار اُن کو توحید کا سبق پڑھانے کے لیے کافی تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کی شہادت میں یہی راز پوشیدہ تھا، ورنہ تلواروں کی برِش اور زہر کا ہلاکت آفریں اثر کہاں اور یہ مقدس ہستیاں کہاں۔

دربارِ شام کا ایک منظر

ایک عربی خاتون کی جوانمردی

وہ بے پناہ تلوار جو خندق میں بلند ہوئی، اُحد میں چمکی اور خیبر میں مصروفِ کارزار رہی مدت سے زیرِ نیام ہے، اسلام کا وہ شیر جس نے عرب کے ہر مدعیِ شجاعت کے چھکے چھڑا دیئے تھے عرصہ سے نجف میں موت کی گہری نیند پڑا سو رہا ہے، اب عالمِ اسلام میں بنی اُمیّہ کا دَور دورہ ہے، دمشق مرکزِ خلافت ہے اور دُنیا کی دولت سمٹ سمٹ کر وہاں جمع ہو رہی ہے، قصرِ خلافت جو کوفہ میں زہد و تقویٰ، سادگی و رواداری کا مسکن بنا ہوا تھا، جہاں سے شب و روز تکبیر، تسبیح اور تہلیل کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، جہاں مظلوموں کی داد رسی اور حاجتمندوں کی حاجت روائی ہوتی تھی، جہاں بوسیدہ بوریئے پر رسولِ اسلام کا وہ جانشین رونق افروز ہوتا تھا جس کی

زبان سے علوم و فنون کے دریا بہتے تھے، جسکے سادہ مگر پُر جلال دربار کو دیکھ کر کافر بھی کلمہ پڑھنے لگتے تھے، جسکے گرداگرد ہمیشہ صحابۂ رسولؐ، مجاہدینِ ملت اور ماہرینِ علم و فن کا مجمع رہتا تھا تاکہ اصلاحِ اُمّت کی تدبیروں پر غور کیا جائے اور بڑھتے ہوئے فتنوں کو روک کر قیامِ امن و امان کی داغ بیل ڈالی جائے۔

دمشق میں یہی قصرِ خلافت رندی اور ہوسناکی کا اڈا، اور کبر و غرور کا مرکز بن کر رہ گیا ہے، تکبیر و تہلیل کی آوازیں یا تو بلند ہی نہیں ہوتیں یا مینا کی قلقل، رومی باجوں کے بلند آہنگ نغموں اور شاہدانِ توبہ شکن کے رقص و سرود میں غائب ہو کر رہ جاتی ہیں، جواہر نگار تخت پر وہ قیصر خصال اور نار اعمال شخص ہے جو زرق برق لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی وجہ سے نہ تو جمہوریہ عربیہ کا صدر نظر آتا ہے نہ مامور من اللہ رسولؐ کا جانشین، بلکہ کسی شخصی سلطنت کا سلطان العنان تاجدار معلوم ہوتا ہے، اسکے گرداگرد موقع بیں اور انجام ناآشنا قسمت آزماؤں کا وہ گروہ ہے جو ذاتی اغراض کی قربان گاہ پر "مفادِ ملت" کی بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

یکایک دور سے ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا، سب کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں، قافلے کی سردار ایک خاتون تھی، جب وہ دربار کے قریب پہونچی تو

اُس نے حاجب کے ذریعے سے اندر آنے کی اجازت مانگی، امیرِ شام نے اُس کو فوراً اندر بلا لیا، دیکھا تو وہ عمارہ ابن اشتر کی بیٹی "سودہ" تھیں، سودہ کو سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر جنگِ صفین کا منظر امیرِ شام کے سامنے آگیا، معمولی دُعا سلام کے بعد کہنے لگا :-

امیرِ شام :-[له] انتِ القائلة یوم الصفین لاخیک۔

شمر کفعل ابیک یا ابن عمارة　　یوم الطعان وملتقی الاقران

وانصر علیاً والحسین ورهطه　　واقصد لهند وابنها بهوان

ان الامام اخا النبی محمداً　　علم الهدیٰ ومنارة الایمان

"کیا صفین کی لڑائی میں تو نے ہی اپنے بھائی کو یہ شعر سنا کر جرأت دلائی تھی

"اے عمارہ کے بیٹے آج نیزے مارنے اور بہادروں کے مقابلے کا دن ہے، تو اپنے باپ کی طرح (حملہ کے لیئے) دامن اُٹھا لے اور علیؑ اور حسینؑ اور ان کی جماعت کی مدد کر اور ہندہ اور اُس کے بیٹے کے ذلیل کرنے میں کسر نہ اُٹھا رکھ کیونکہ ہمارا امام نبی صلی اللہ علیہ وآلہ کا بھائی، ہدایت کا نشان اور ایمان کا منارہ ہے۔"

سودہ :- یا امیر مات الراس بتر الذنب　　فدع عنک تذکار قد نسی

"اے امیر! آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند، وہ چادر ہی نہ رہی جس میں سُتو بندھتے تھے، گزری ہوئی باتوں کا اب ذکر ہی کیا۔"

له عربی عبارتوں کا لفظی ترجمہ نہیں کیا گیا صرف مفہوم کو اردو محاورے میں ادا کر دیا گیا ہے۔

امیر شام: ھیھات لیس مقام اخیک ینسی"

"سودا! تیرے بھائی کا ذکر ایسا نہیں ہے کہ اُسے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا جائے۔"

سودہ: صدقت واللّٰہ یا امیر ولکن اسئلک باللہ اعفانی عما استعفیتہ۔

"اے امیر! خدا کی قسم آپ سچ کہتے ہیں، مگر جو کچھ مجھے ہوا ہے اُسکو خدا کے لیے اب معاف کر دیجئے!"

امیر شام: قد فعلت "اچھا میں نے معاف کیا" ملحاجتک

"یہ تو بتا کہ میرے پاس کس غرض سے آئی ہے"

سودہ۔ یا امیر انک صرت للناس سید اولاموھم مقلدا واللہ سائلک عما افترض علیک من حقنا ولا یزال تقدم علینا من ینھض بعزک ویبسط بسلطنک فیحصد ناحصاد السنبل

"اے امیر! تو آپ لوگوں کے سردار بن بیٹھے ہیں اور اُن کے تمام معاملات کا بار آپ کی گردن پر ہے، خدا نے جو ہمارے حقوق آپ پر فرض کیے ہیں اُنکے متعلق وہ ضرور باز پرس کرے گا، آپ ہمیشہ ہم پر ایسا عامل مقرر کرتے ہیں جو آپ کی عزت کے بل بوتے پر ہم پر حکومت کرتا ہے اور آپ کی طاقت کے گھمنڈ پر ہاتھ پیر پھیلانے لگتا ہے اور کھیتی کی طرح ہمکو کاٹتا ہے۔"

هذا ابن ارطاة قدم بلادي قتل رجالي واخذ مالي ولولا الطاعة لكان فينا عز ومنعة فاما عزلته فشكرناك واما لا ....

"یہ ابن ارطاۃ جو ہماری بستیوں پر حاکم بنا کر بھیجا گیا ہے اس نے ہمارے مردوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا ہے اور ہمارا مال و زر چھین لیا ہے، اگر آپ کی اطاعت کا خیال نہ ہوتا تو ہم بھی قوت رکھتے تھے اور (اس فتنہ کو) دفع کر سکتے تھے اگر آپنے اس کو معزول کر دیا تو ہم ممنون ہونگے ورنہ ہم اپنی جانیں دیدیں گے۔"

امیر شام۔ ایای تھددین بقومك والله لقد هممت ان ارد الیك الیه فینفذ حکمه فیك۔

"کیا تو مجھے اپنی قوم سے ڈراتی ہے واللہ میرا ارادہ ہو کہ تجھ کو (ابن ارطاۃ ہی کے پاس بھیجدوں تاکہ وہ تجھپر اپنا حکم جاری کرے۔

سودہ۔ (پہلے تو خاموش ہوئی پھر کڑک کر یہ شعر پڑھنے لگی)

صلی الاله علی روح تضمنه قبر فاصبح فیه العدل مدفونا

"خدا اس روح پر رحمت نازل کرے جس کو قبر نے اپنے سینے سے لگا لیا ہے (اے قبر خوشا حال تیرا) کہ عدل مجسم تیرے اندر دفن ہے۔"

امیر شام "من ذالك" "یہ کس کا ذکر کر رہی ہے؟"

سودہ۔ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا۔"

امیر شام: کیا کوئی واقعہ ہے؟"

سودہ: بلیٰ اتیتہ یوماً فی رجلٍ ولاہ صدقاتنا فوجدتہ قائماً یصلّی فانفتل من الصلوٰۃ ثم قال برافۃ وتلطف لک حاجۃ فخبرتہ خبر الرجل فبکیٰ ثم رفع راسہ الی السماء فقال اللھم انت تعلم انی لم آمرھم بظلم خلقک و ترک حقک ثم اخرج من جیبہ قطعۃ من جراب فکتب فیہ۔

"ہاں! ایک دن میں ایک ایسے شخص کی شکایت لے کر حضرت کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی جس کو آنجناب نے ہمارے صدقات کی وصولی پر مقرر کیا تھا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ آپ نماز میں مصروف ہیں سلام پھیرنے کے بعد آپ نے نہایت نرمی اور مہربانی سے پوچھا کیا تم کو کچھ کام ہے۔ میں نے آپ سے شخص مذکور کا پورا حال بیان کیا۔ آپ سن کر رونے لگے پھر آسمان کی طرف منھ کر کے کہا اے پروردگار! تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے عاملوں کو تیری مخلوق پر ظلم کرنے اور تیرا حق چھوڑنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ پھر اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرچہ نکال کر لکھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قد جاءتکم بینۃ من ربکم فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ذالکم خیر لکم ان کنتم مومنین اذا اتاک کتابی ھذا فاحفظ فی یدیک حتی یقبض منک والسلام

تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی ہیں پس
تم اپنے پیمانے اور ترازو پوری رکھو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور
اصلاح کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔ اگر تم ایمان والے ہو تو یہ تمہارے لئے
بہتر (طریقہ) ہے جب یہ میرا حکمنامہ تم کو ملے تو جو کچھ تمہارے پاس ہے اسکو محفوظ
رکھو یہاں تک کہ اس کا لینے والا (تمہارے پاس پہونچ کر) اس کو تمہاری تحویل
سے لے لے والسلام۔ (فعزلہٗ اسکے بعد حضرت نے اسکو معزول کر دیا)

امیر شام (اپنے وزیروں سے مخاطب ہو کر) اکتبوا لہ بالانصاف علیہا
والعدل علیہا (عامل کو لکھ دو کہ اس عورت کے ساتھ عدل و انصاف کا
سلوک کیا کرے۔)

سودہ۔ لی خاصۃ ام لقومی (عدل و انصاف کا سلوک صرف میرے ساتھ
کرے یا میری تمام قوم کے ساتھ؟)

امیر شام: ما انت وغیرک (تجھ کو دوسروں سے کیا غرض ہے)

سودہ: ان کان عدلاً شاملاً والا یسعنی مایسع (عدل ہو
تو عام ہو ورنہ جو قوم کا حال وہ میرا حال۔

امیر شام: ہیہات علمکم ابن ابیطالب الجرأت علی السلطان
ہائے غضب علی ابن ابیطالب نے تمہاری جرأتیں بڑھا دی ہیں کہ سلطان کے دربار میں
بھی آزادانہ گفتگو سے نہیں ڈرتیں۔

(عقد الفرید لابی عمر احمد بن عبد ربہ الاندلسی)

x x x x x x x x x x x x x x x x x x x x

ہیبت اور استبداد کے طویل دَور کے بعد چند روز کے لئے عرب کی قسمت جاگ اٹھی تھی۔ مرکزِ خلافت کے عدل و انصاف کی شہرت اسقدر عام ہوگئی تھی کہ عورتیں تک بھی آزادانہ دربارِ خلافت میں حاضر ہوتی تھیں اور بڑے سے بڑے عامل کے خلاف مرافعہ کرکے اپنا حق حاصل کرتی تھیں۔ لیکن ایک بجلی تھی جو گھنگھور گھٹا میں کوند کر غائب ہوگئی۔ بھادوں کے مہینہ کا ابر پارہ تھا جو برسا اور کھل گیا، اب پھر وہی تاریکی تھی اور ابرِ عدل کے چند چھینٹوں نے برسوں کی پیاسی زمین کی پیاس کو اور بڑھا دیا۔

وہ آنکھیں جو حضرت علیؑ اور ان کی دادرسی کو دیکھ چکی تھیں، وہ ہستیاں جو انصاف دوست اور عدل پرور حکام کی خوگر ہوگئی تھیں، چاروں طرف نظر ڈالتی تھیں۔ مگر سناٹا ہی سناٹا دکھائی دیتا تھا۔

ابن ارطاۃ کی دراز دستیاں حد سے گذر گئی ہیں۔ لوگ اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر بغاوت پر آمادہ ہیں۔ بہادر باپ کی بہادر بیٹی، جری بھائی کی جری بہن سودہ وفد لیکر دربارِ خلافت کی طرف چل کھڑی ہوتی ہے۔ وقت تھا کہ جب اسکے اونٹوں کا رُخ کوفہ کی طرف جاتا تھا۔ اب مرکزِ خلافت بدل چکا تھا اور دربار تک پہونچنے کیلئے اونٹوں کو طویل سفر طے کرنا تھا۔

لق و دق ریگستان کو عبور کر کے قافلہ دمشق میں داخل ہوا اور وہی خاتون جو بوسیدہ بورئیے پہ بیٹھنے والے خلیفہ کے سامنے پیش ہوئی تھی، آج اُس بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو رہی ہے جسکی پیشانی کی شکن، اطلس و دیبا کی قبا، نگینہ جڑی کرسی حضرت عمر کے اُس قول کی صداقت ظاہر کر رہی ہے کہ "معاویہ ایک دن مسلمانوں کا قیصر ہوگا۔"

سودہ کو سامنے دیکھ کر امیر شام کے پرانے زخم ہرے ہو گئے، نگاہ کے سامنے صفین کا وہ خونی منظر آ گیا جب تدبیر اور تقدیر میں باہمی کشمکش ہو رہی تھی، صفین کی راتیں تھیں، تلواریں بجلیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور سودہ کا بہادر بھائی مالک اشتر کے ساتھ شامیوں کے لشکر کو فصل کی طرح کاٹ کاٹ کر گرا رہا تھا، ہائے کیسا نازک موقع تھا، بہادر میدان میں للکار رہے تھے اور امیر شام خوف و رجا کے عالم میں زربافتہ خیمے میں چھپے ہوئے تھے لمحہ بلمحہ جاسوس آتے تھے اور میدان کی خبریں دیتے تھے، لو شام کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے، کوفہ کے بہادر بڑھے چلے آ رہے ہیں، اب معاویہ کا خیمہ چند قدم ہی پہ ہے، سودہ اپنے بہادر بھائی کا دل بڑھا رہی ہے، دیکھنا آج ابوسفیان کی اولاد کا نام و نشان باقی نہ رہ جائے، بھائی بہن کے جرأت آموز اشعار سن کر شیر کی طرح حملہ کر رہا ہے، قریب ہے کہ امیر شام کا سر غرور خاک و خون میں لوٹتا نظر آئے کہ قرآن نیزوں پر بلند ہو گئے اور علیؑ کی فوج کے

بگڑے ہوئے سپاہیوں نے مالک اشتر کو معاویہ کے خیمے کی طرف بڑھنے سے روک دیا، مالک اشتر کی تلوار ابھی کام کر رہی تھی، بس دو چار واروں کی کسر باقی تھی کہ ایک قاصد علیؑ کا یہ پیغام لے کر آیا۔ بھائی اب بھی دیر کی تو میری لاش کو خاک و خون میں لوٹتا ہوا پاؤ گے۔

عمرو عاص اور معاویہ کا افسوں کارگر ہو چکا تھا اور اب کوفہ کے سپاہی پورس کے ہاتھیوں کی طرح اپنی ہی فوج کو کچل رہے تھے، یہ سارا منظر ہشام کے سامنے تھا، اللہ رے انقلاب اُس بھائی کی بہن جو اُسکے لیے پیامِ اجل بنا ہوا تھا آج اُسکے سامنے کھڑی تھی، بے اختیار اُسکے منہ سے نکل گیا کہ سودہ تو وہی ہے جس نے صفین کی لڑائی میں یہ شعر پڑھے تھے، امیر ہشام نے یہ شعر پڑھکر اُس غم کو تازہ کر دیا جو برسوں سے دل میں پوشیدہ تھا، مردہ بھائی کی یاد تازہ ہو گئی، ہائے اگر آج وہ زندہ ہوتا تو سودہ کو اس دربار میں آنے کی ضرورت نہ پڑتی، حالات نا سازگار تھے، زمانہ بدل چکا تھا، سودہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "اے امیر جو گزر گیا گزر گیا" امیر ہشام نے کہا کہ تیرے بھائی کی یاد ایسی نہیں ہے کہ اُس کو آسانی سے بھلا دیا جا سکے، اب ایک مصیبت زدہ عورت کے لیے جو عامل کے ظلم و ستم کی فریاد لیکر آئی ہو سوائے اسکے کیا چارہ تھا کہ وہ عفو کی التجا کرتی، یہ بات ختم ہوئی تو امیر ہشام نے پوچھا کہ تیرے یہاں تک آنے کا مقصد کیا ہے؟

کسی حریت پسند قوم کی آزادروی اور صاف بیانی کو مٹانے کے لئے برسوں کے استبداد کی ضرورت ہے، علیؑ کے ساوات پرور اور حریت آفریں دور کو گزرے ہوئے ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے۔

سودہ نے اس جرات کے ساتھ جو ایک عربی کا حصہ ہے سرِ دربار امیر شام کے عامل ابن ارطاۃ کے مظالم کی شکایت کی، سودہ اپنا شکایت نامہ پیش کر رہی تھی اور امیر شام کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا، مطلق العنان شخصی بادشاہوں کے درباروں میں ایسی بیباکی اور جراءت کب برداشت کی جا سکتی تھی، وہ اس خاتون کے بیان کا اثر اہل دربار کے چہروں پر دیکھ رہا تھا، یکایک شکایت کی داستان ختم ہوئی اور ابوسفیان کا مدبر بیٹا سنبھل کر بیٹھا اور کہنے لگا "میں تجھکو اپنے عامل کے پاس بھیجدوں گا کہ وہ تجھکو اس جرات اور بیباکی کی سزا دے"، کن کن امیدوں کو لے کر سودہ نے ریگستانوں کا صبر آزما سفر طے کیا تھا، وہ کیا سوچ کے گھر سے بے گھر ہوئی تھی اور یہاں کیا ہو رہا تھا، وہ سمجھی تھی کہ جس طرح علیؑ نے اسکی فریاد رسی کی تھی اسی طرح معاویہ بھی اسکی آواز کو سنے گا، اُسے کیا خبر تھی کہ ابن ارطاۃ ایسے ظالم و جابر لوگوں ہی کے بل بوتے پر معاویہ تخت خلافت تک پہونچا ہے اُن کو ناراض کر کے وہ ایک دن بھی حکمرانی نہیں کر سکتا، اب سودہ کی باری تھی کہ اس کے آنکھوں کے آگے علیؑ کے دورِ خلافت کا منظر آئے، شاعرہ کے احساس بھڑک اٹھے اس کے مُنہ سے بیساختہ یہ شعر نکل گیا

صلی الالہ علی روح تضمنہ   قبرٌ فاصبح فیہ العدل مدفوناً

"اس روح پر خدا کی رحمت ہو جس کو قبر نے سینے سے لگا لیا ہے کہ عدل و انصاف بھی اس کے ساتھ دفن ہو گیا ہے۔"

معاویہ چونکا، قبیلہ ہمدان کی شاعرہ کس کے عدل و انصاف کو یاد کر رہی ہو، ہائے سچی تعریف وہی ہوتی ہے جو کسی کے مر جانے کے بعد کی جائے کہ اُس وقت خوف و طمع دونوں موجود نہیں ہوتے اور جب یہ تعریف دشمن کے دربار میں ہو تو اس کی صداقت اور بڑھ جاتی ہے، اب معاویہ دریافت کر رہا ہے کہ یہ کس کے عدل و انصاف کے گُن گا رہی ہو؟ اور جواب ملتا ہے کہ علی کے، وہ پوچھتا ہے کہ میں بھی تو سنوں، علی نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا؟ قبیلہ ہمدان کی فصیح خاتون گزرے ہوئے زمانے کی کہانی سناتی ہے، "میں ایک دن علیؑ کے پاس ان کے عامل کی شکایت لیکر گئی، میں نے ان کو رقص و سرور کی محفل میں نہیں بلکہ نماز میں پایا، نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنی مصیبت بھری داستان سنائی، میں اپنا حال بیان کر رہی تھی اور علیؑ زار و قطار رو رہے تھے کہ میرے عہد حکومت میں ظلم ہو رہے ہیں، فوراً عامل کے نام مراسلہ بھیجا اور اسکو عہدے سے معزول کر دیا، امیر شام نے یہ فیصلہ سنا تو اُن کے عدل و انصاف کے جذبۂ خوابیدہ نے بھی انگڑائی لی اور وزیروں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "عامل کو لکھ دو کہ اس عورت کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرے۔" امتیاز پرست امیر سمجھتا ہو گا کہ اس مخصوص عزت

کے لئے ہمدانی خاتون اس کا شکریہ ادا کرے گی اسے کیا خبر تھی کہ یہ علی کا سادات پروردہ دور دیکھے ہوئے ہے۔ یہ اتنی دور کا سفر اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی ساری قوم کے لئے طے کر کے آئی ہے۔

امیر شام لاکھ لاکھ کہتے رہے کہ "تجھے دوسروں سے کیا کام تو ہمارے ظل عنایت میں چین سے زندگی بسر کئے جا"، گر وہ زمانی اب ابوسفیان کے فرزند کی آنکھیں کھلیں اور انھیں محسوس ہوا کہ گو علی دنیا سے گزر گئے مگر آزادی ضمیر اور حریت خیال کا جو تخم انھوں نے سرزمین اسلام پر بو دیا تھا وہ آہستہ آہستہ نشوونما پا رہا ہے استبداد اور ظلم و جور کی مسلسل جد و جہد برسوں میں جا کر اس حریت پسندی کا خاتمہ کرے گی،

مطلق العنان شخص حکمراں نے صنف لطیف کو اس جرأت شیا کی کے ساتھ اپنے اور اپنی قوم کے حقوق کی وکالت کرتے ہوئے کب دیکھا تھا، وہ چیں بہ جبیں ہو کر اس خاتون کا منھ دیکھنے لگا، ان فقروں پر غور کرو جو اس وقت امیر شام کے منھ سے نکلے، دیکھو یہ اس کے دل کی بے چینی اور کرب کی کس خوبصورتی سے غمازی کر رہے ہیں۔

" هيهات علمكم ابن ابيطالب الجرأة على السلطان "

" اے ابی طالب کے فرزند نے تم کو بادشاہوں کے حضور میں آزادانہ گفتگو کرنے کی عادت ڈال دی ہے "

یہ یادگار الفاظ منہ سے نکال کر امیرِ شام نے علیؑ کے طرزِ جہانبانی کو وہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے جس کا لطف کچھ مدبرانِ عالم اُٹھا سکتے ہیں، کوا تھا جو ابوسفیان کے بیٹے کو بتا تا کہ اسلام آیا ہی اس لئے تھا کہ شاہ و گدا کے امتیاز کو مٹا کر بنی آدم کو بھائی بھائی بنا دے، برسوں کی مٹی ہوئی جرأتوں کو زندہ کرے اور ہر فرد کو اپنے جائز حقوق کے حصول کی آزادی دے۔

اگر دنیا منہاجِ رسالت و طریقِ آلِ محمد پر چلتی تو نہ معلوم آج بنی آدم ترقی کے کس زینے پر پہونچ گئے ہوتے۔

انقلاب فرانس نے آگے چل کر جس جذبہ آزادی کو بیدار کیا، انقلاب روس نے جس کو شاہراہ پر ڈال دیا، اس کی بنیاد اصل میں اسلام کے اس درویش صفت شہنشاہ کے دور میں پڑ چکی تھی۔